تعلیم اور سماجی نظام

برٹرینڈرسل

مترجم۔ قاضی جاوید

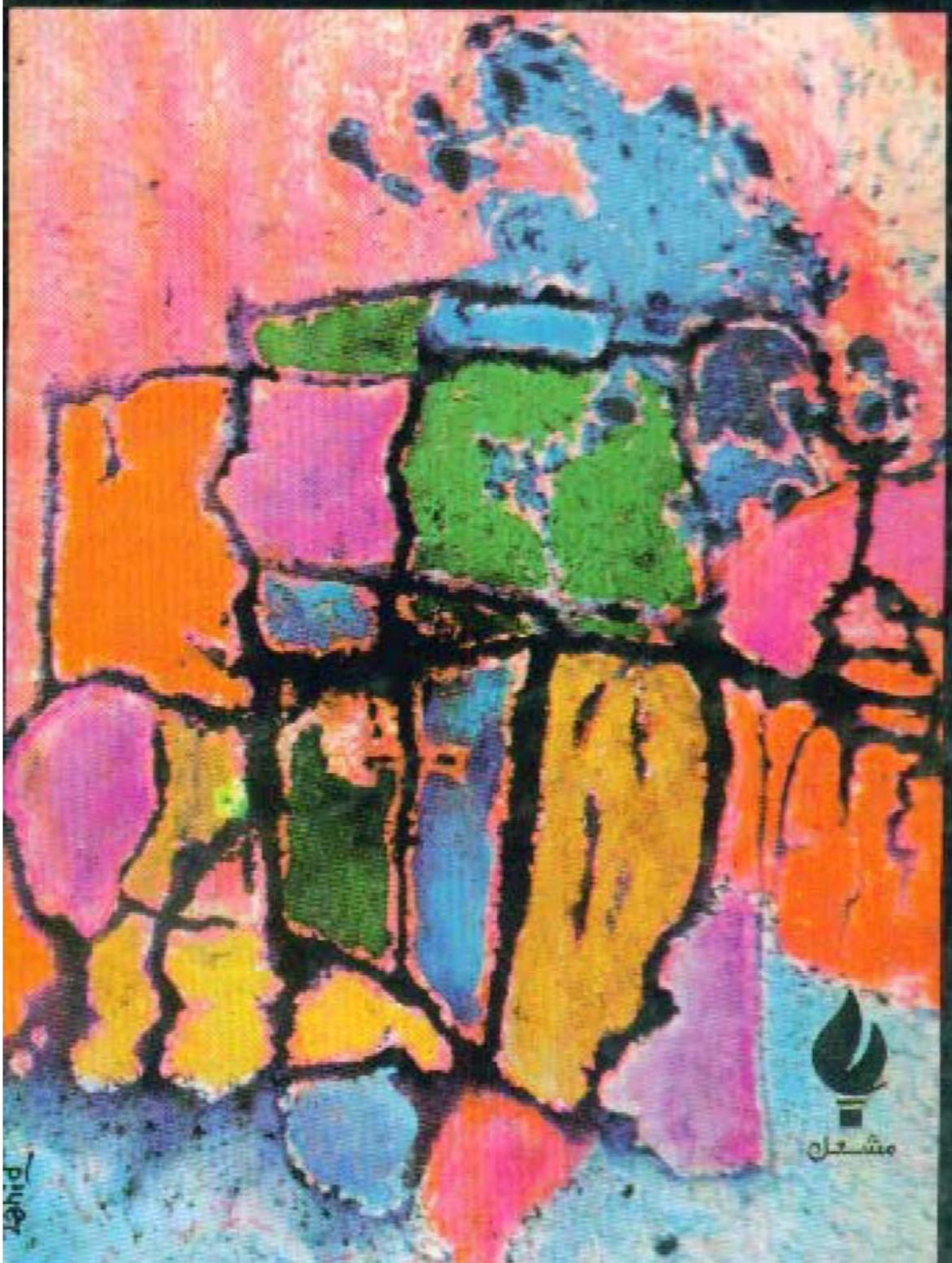

مشعل

http://muftbooks.blogspot.com/

تعلیم اور سماجی نظام

http://muftbooks.blogspot.com/

تعلیم اور سماجی نظام

برٹرینڈ رسل

مترجم: قاضی جاوید

مشعل

آر-بی 5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور 54600، پاکستان

http://muftbooks.blogspot.com/

تعلیم اور سماجی نظام

مصنف: برٹرینڈ رسل

اردو ترجمہ: قاضی جاوید

کاپی رائٹ(c) انگریزی انون اینڈ ہائی مین
کاپی رائٹ(c) اردو ــ1992 مشعل

پہلی اشاعت 1992

دوسری اشاعت 1996

تیسری اشاعت 2010

ناشر: مشعل

آر بی 5، سیکنڈ فلور،

عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور-54600، پاکستان

فون و فیکس 042-35866859

E-mail: mashbks@brain.net.pk

http://muftbooks.blogspot.com/

ترتیب

پہلا باب	فرد اور شہری کا موازنہ	۵
دوسرا باب	تعلیم کا منفی نظریہ	۱۹
تیسرا باب	تعلیم اور وراثت	۳۰
چوتھا باب	جذبہ اور نظم وضبط	۳۷
پانچواں باب	گھر بمقابلہ سکول	۴۴
چھٹا باب	امرا، جمہوریت پسند اور افسر شاہی	۵۲
ساتواں باب	تعلیم اور انبوہ	۶۲
آٹھواں باب	تعلیم اور مذہب	۷۲
نواں باب	تعلیم اور جنس	۸۴
دسواں باب	تعلیم میں حب الوطنی	۹۵
گیارہواں باب	تعلیم میں مقابلے کا تصور	۱۰۶
بارہواں باب	تعلیم اور معاشیات	۱۲۰
تیرھواں باب	تعلیم میں پروپیگنڈا	۱۳۲
چودھواں باب	انفرادیت اور شہریت میں ہم آہنگی	۱۴۶

http://muftbooks.blogspot.com/

پہلا باب

فرد اور شہری کا موازنہ

جدید زمانے کی تمام مہذب ریاستیں تعلیم کو پسندیدہ خیال کرتی ہیں۔ ان کے باوجود بعض ایسے لوگ ہر عہد میں اس رائے سے اختلاف کرتے رہے ہیں، اور ان کی رائے احترام کی حامل رہی ہے۔ تعلیم کی مخالفت کرنے والوں کا نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ تعلیم اپنے مقرر کردہ مقاصد حاصل نہیں کر سکتی۔ لہٰذا ان صاحبان کی رائے کا مناسب تجزیہ کرنے سے پہلے ہمیں لازماً یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ کون سے مقاصد ہیں جن کو ممکنہ طور پر حاصل کرنا تعلیم کا کام ہے۔ اس موضوع پر ویسے ہی مختلف نقطۂ ہائے نظر ہیں جیسے کہ انسانی فلاح سے متعلق بہت سے تصورات ہیں۔ البتہ ایک ایسی مزاجی خلیج بھی ہے جو دوسرے تمام اختلافات سے زیادہ گہری ہے۔ یہ خلیج تعلیم کو بنیادی طور پر انفرادی نفسیات کے حوالے سے دیکھنے والوں اور اس پر جماعت کے حوالے سے غور کرنے والوں کے مابین حائل ہے۔

یہ فرض کرتے ہوئے (جیسا کہ ہم آئندہ باب میں دلائل پیش کریں گے) کہ تعلیم کو محض نشوونما کی راہ میں حائل رکاوٹیں ہی دور نہیں کرنی چاہیں بلکہ تربیت کا سامان بھی بہم پہنچانا چاہیے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا تعلیم کا مقصد اچھے افراد پیدا کرنا ہے یا اچھے شہریوں کی تربیت کرنا ہے۔ وہ صاحبان جو ہیگل کے خیالات کے حامی ہیں وہ تو ضرور ہی کہیں گے کہ ایک اچھے شہری اور اچھے فرد میں کوئی تضاد نہیں ہو سکتا۔ اچھا فرد وہ ہے جو اجتماعی بھلائی کو پیش نظر رکھتا ہے اور جہاں تک اجتماعی بھلائی کا تعلق ہے وہ افراد کی بھلائی پر ہی مشتمل ہوا کرتی ہے۔ خیر، ایک مطلق مابعد الطبعیاتی صداقت کے طور پر میں اس نظریئے کی تائید کرنے یا اس سے اختلاف کرنے پر آمادہ نہیں۔ تاہم روزمرہ کی عملی زندگی میں ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ بچے کو مستقبل کا ایک شہری خیال کرتی ہے۔ بظاہر دکھائی یہ دیتا ہے کہ انفرادی ذہن کی تربیت مفید شہری کی تیاری سے مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جیمز

http://muftbooks.blogspot.com/

واٹ کے مقابلے میں گوئٹے کم مفید شہری تھا، لیکن فرد کی کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اسے لازماً جیمز واٹ سے بہتر خیال کرنا چاہیے۔ بات یہ ہے کہ انفرادی بھلائی اجتماعی اچھائی کا محض ایک جزو نہیں، بلکہ اس کے علاوہ بھی کوئی شے ہے۔ انفرادی بھلائی کے بارے میں مختلف لوگوں کی رائے سے مختلف ہوا کرتی ہے اور میں ان لوگوں کے ساتھ بحث کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا جو میری رائے سے مختلف نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ نظریہ چاہے جو بھی ہو، اس حقیقت کو جھٹلانا دشوار ہے کہ فرد کی نشو ونما اور شہری کی تربیت میں فرق ہے۔

فرد کی بھلائی کون سے عناصر پر مشتمل ہے؟ یہاں میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ اگرچہ ضروری نہیں کہ دوسرے لوگ بھی میرے ساتھ متفق ہوں۔

پہلی اور اہم بات تو یہ ہے کہ جرمن فلسفی لائبنٹز کے واحدوں کی طرح فرد کو بھی دنیا کی عکاسی کرنی چاہیے۔ کیوں؟ میرے پاس اس سوال کا جواب محض یہ ہے کہ علم اور ہمہ گیریت مجھے ایسی دو شاندار خوبیاں معلوم ہوتی ہیں جن کے حوالے سے میں نیوٹن کو کستورا مچھلی پر ترجیح دے سکتا ہوں۔ اپنے ذہن میں مکان کی وسعتوں، سورج اور چاند ستاروں کے ارتقاء زمین کے ارضیاتی ادوار اور نسل انسانی مختلف تاریخ کو واضح اور مرکز و انداز میں سمیٹ لینے والا شخص میرے نزدیک کسی شے کے بغیر امتیازی انسانی عمل میں شریک دکھائی دیتا ہے وہ فطرت کے متنوع مناظر میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔

انسان کی فضلیت کی بنیاد اگرچہ اس کے شعور پر ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں۔ محض کائنات کی آئینہ داری کافی نہیں۔ یہ آئینہ داری جذبے کے ساتھ ہونی چاہیے۔ جذبہ مقصد کے حسب حال ہونا چاہیے اور محض علم حاصل کرنے کے عمل میں ایک عمومی مسرت کو شامل حال ہونا چاہیے۔ پھر بھی ایک مکمل اور بھرپور انسان کے لیے جاننا اور محسوس کرنا ہی کافی نہیں۔ اس تغیر پذیر دنیا میں انسان خود بھی تبدیلی کا باعث ہے۔ اپنی اس حیثیت کے شعور میں انسان اپنے ارادے کو بروئے کار لاتے ہیں اور قوت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ انسانی ذات کی تکمیل کی جستجو میں علم، ارادہ اور قوت کو ممکنہ حد تک وسعت دینی چاہیے۔ روایتی مذہبی فکر کے مطابق قوت، دانش اور محبت تثلیث کے تین اوصاف ہیں۔ کم از کم اس حوالے سے انسان نے اپنے ہی روپ میں خدا کو تخلیق کیا ہے۔

اس ساری بحث میں ہم انسان کو فرد کی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں۔ نقطۂ نظر کا یہ وہی انداز ہے جو بدھ مت، رواقی فلسفیوں، مسیحی درویشوں اور تمام صوفیوں کا رہا ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

ایک مکمل فرد میں علم جذبہ کے جن عناصر کی ہم نے تصویر کشی کی ہے، وہ بنیادی طور پر سماجی نہیں ہیں۔ ارادے اور قوت کو بروئے کار لانے کے بعد ہی وہ فرد، جس کا ہم تصور کر رہے ہیں، کسی معاشرے کا موثر رکن بن سکتا ہے۔ اس صورت میں بھی ارادہ کسی انسان کو جو مقام مہیا کر سکتا ہے، وہ ایک آمر کا ہے۔ فرد کے ارادے کو اگر الگ تھلگ کر کے دیکھا جائے تو وہ خدائی ارادے جیسا دکھائی دیتا ہے جو ''کن'' کہنے کا عادی ہے۔ شہری کا رویہ اس سے بہت مختلف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا میں محض اس کا ارادہ ہی موجود نہیں ہے۔ وہ کسی نہ کسی انداز سے معاشرے میں موجود متصادم ارادوں میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ فرد کی حیثیت سے ہر فرد اپنے تئیں قائم بالذات ہے جبکہ شہری لازمی طور پر اپنے آپ کو ہمسایوں میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ بلاشبہ روبنسن کروسو کے سوا ہم سب شہری ہیں اور یہ امر لازمی طور پر تعلیم کے پیش نظر رہنا چاہیے۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیاسی زندگی کی مصلحت کوشیوں اور عملی سمجھوتوں پر آمادہ ہونے سے پہلے اگر ہم فرد کے طور پر اپنے امکانات سے آگاہ ہوں تو بالآخر ہم بہتر شہری بن سکیں گے۔ ایک شہری کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ عملی طور پر نہ سہی، کم از کم ارادے کے اعتبار سے دوسرے لوگوں کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہوتا ہے۔ اب معاملہ یہ ہے کہ جو شخص تعاون کرنے کا خواہش مند ہوا اسے، بشرطیکہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل نہ ہو، کسی ایسے بنے بنائے مقصد کی تلاش ہوتی ہے، جس کو وہ اپنا رہنما بنا سکے۔ کوئی بہت زیادہ غیر معمولی عظمت کا حامل شخص ہی الگ تھلگ رہ کر ایسا کوئی منصوبہ بنا سکتا ہے جو دوسروں کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بن سکے۔ نیز صرف ایسا شخص ہی مقصد کا تعین کرنے کے بعد دوسروں کو اس میں تعاون کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے۔ تاریخ میں ایسے لوگ ہوئے ہیں۔ بہرحال یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ شہریت کی ایسی خلوت گزیں اور تخلیقی صورتیں شاذ و نادر ہی ہوا کرتی ہیں اور وہ اس قسم کی تعلیم سے شاید ہی پیدا ہوتی ہیں جس کا مقصد شہریوں کی تربیت ہو۔ حکومتوں کے نزدیک شہریوں کا تصور یہ ہے کہ وہ حالت کو جوں کا توں رکھنے کے خواہش مند لوگ ہوتے ہیں اور کسی تبدیلی کو روکنے کے لیے تگ و دو بھی کرتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اگرچہ تمام حکومتیں صرف اور صرف اسی قسم کے جمود پسند عوام تیار کرنا چاہتی ہیں، لیکن تاریخ میں ان کے ہیرو ہو بہو اسی قسم کے افراد ہیں جو قطعی طور پر ''جمہوریت پسند'' نہیں۔ مثال کے طور پر امریکی جارج واشنگٹن اور جیفرسن کے گن گاتے ہیں، لیکن ان جیسے سیاسی خیالات رکھنے

http://muftbooks.blogspot.com/

والوں کو قید خانے میں بند کر دیتے ہیں۔ تمام مغربی قومیں حضرت عیسیٰؑ کی مداح ہیں لیکن وہ آج کے زمانے میں زندہ ہوتے تو پولیس کے جاسوس ان کا پیچھا کر رہے ہوتے۔ اسی طرح امریکی انہیں حق شہریت دینے سے انکار کر دیتے کیونکہ حضرت عیسیٰؑ ہتھیار باندھنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ ان مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایک نصب العین کی حیثیت سے شہریت ناکافی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہریت تخلیقی پن سے عاری ہے۔ شہری، حکومتوں سے، چاہے وہ شخصی ہوں یا جمہوری، مصالحت پر آمادہ رہتے ہیں۔ یہ وہ بات ہے جو عظیم ترین افراد کے امتیازی اوصاف کی ضد ہے اگر اس امر پر زیادہ زور دیا جائے تو وہ عام لوگوں کو اس عظمت کے حصول سے روکتی ہے جس کے وہ اہل ہوتے ہیں۔

میں ہرگز نہیں چاہتا کہ مجھے بغاوت کے حامی کے طور پر سمجھا جائے۔ بذات خود بغاوت مصالحت پسندی سے کسی طور بہتر نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس کا تعین بھی قدر کے معاملے میں خالص نجی فیصلے کے بجائے خارجی عوامل ہی سے ہوتا ہے۔ بغاوت کی تعریف یا ملامت کا دارومدار اس شے پر ہوتا ہے جس کے خلاف کوئی شخص بغاوت کا پرچم بلند کرتا ہے۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ کبھی کبھار بغاوت کا امکان موجود رہنا چاہیے اور صرف اندھا دھند مصلحت کوشی ہی قائم نہ رہنی چاہیے جسے سمجھوتہ پسندی کی بے لچک تعلیم نے پیدا کیا ہو۔ بغاوت اور مصلحت کوشی سے بھی زیادہ اہم بات غالباً یہ ہے کہ انسان کے لیے ایک بالکل نیا طرز عمل اختیار کرنے کا امکان موجود رہنا چاہیے۔

تعلیم، سیاست، اخلاقیات اور مابعد الطبیعات میں شہریت اور فردیت کا فرق اہم ہے۔ تعلیم کے شعبے میں وہ نسبتاً ایک سادہ عملی پہلو کا حامل ہے جس پر کسی حد تک نظری مسئلے سے ہٹ کر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ کسی پورے معاشرے کے نوجوانوں کی تعلیم ایک مہنگا کام ہے اور یہ کام زیادہ تر ریاست ہی کے ذمے ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ چرچ یا مذہب ہی ایک ایسی تنظیم ہے جو نوجوانوں کے ذہنوں کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کرنے کی خواہش مند ہو سکتی ہے۔ ریاست کا مقصد بلاشبہ یہ ہے کہ شہریوں کی تربیت کی جائے۔ قرون وسطیٰ میں معاملہ یہ تھا کہ تعلیم کا مطلب محض پادریوں کی تعلیم لیا جاتا تھا۔ نشاۃ ثانیہ کے دور سے حالیہ زمانوں تک اس سے مراد شرفا کی تعلیم تھی۔ امارات پرست جمہوریت کے زیر اثر اب اس کا مطلب ایسی تعلیم ہو گیا ہے جو انسانوں کو اشرافیہ کا ظاہری رنگ و روپ عطا کر دے۔ مدرسوں میں ایسی بہت سی باتوں کی تعلیم دی جاتی ہے جن کا اچھا شہری

http://muftbooks.blogspot.com/

بنانے سے تعلق کم ہی ہوتا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلبہ شائستہ اور مہذب بن جائیں۔ تعلیم کے دوسرے عناصر قرون وسطیٰ کی مذہبی روایت کی یادگار ہیں جس کا مقصد انسان کو خدا کے طور طریقوں کو سمجھنے کے قابل بنانا تھا۔ شرافت اور خدا پرستی شہری کے بجائے فرد کے اوصاف ہیں۔ عیسائیت بہ حیثیت مجموعی فرد کا مذہب ہے اور وجہ یہ ہے کہ اس کا ظہور ایسے لوگوں کے درمیان ہوا جو سیاسی قوت سے محروم تھے۔ بنیادی طور پر عیسائیت کا واسطہ روح اور خدا کے مابین تعلق سے ہے، اگرچہ اس نے فرد اور اس کے ہمسائیوں سے تعلق پر بھی نگاہ ڈالی ہے، لیکن وہ اس تعلق کو قوانین اور سماجی اداروں کے بجائے انسان کے اپنے جذبوں کا نتیجہ خیال کرتی ہے۔

آج کے دور کی عیسائیت میں جو سیاسی عنصر دکھائی دیتا ہے وہ شہنشاہ کانسٹائن کی عطا ہے۔ اس کے زمانے سے پہلے حکومت کا حکم نہ ماننا ہر عیسائی کا فرض سمجھا جاتا تھا۔ لیکن کانسٹائن کے زمانے سے زیادہ تر رواج یہ چلا آ رہا ہے کہ حکومت کی فرمان برداری عیسائیوں کا فرض ہے۔ اس کے باوجود عیسائیت میں انارکیت کا جو عنصر تھا، اس نے ایسا خمیر چھوڑا ہے جس کی وجہ سے عیسائیت کی پوری تاریخ میں نافرمانی کے ابتدائی رویئے کا بارہا احیا ہوتا رہا ہے۔ بہت سے ایسے مسیحی گروہ اور جماعتیں پیدا ہوتی رہی ہیں جنہوں نے باطنی روشنی کو ترجیح دیتے ہوئے مختلف طریقوں سے بیرونی اقتدار کو رد کیا ہے۔ پروٹسٹنٹ فرقے کا آغاز بھی اقتدار کے خلاف بغاوت سے ہوا لیکن حکومت پر اختیار حاصل ہونے کے بعد سے اسے مذہبی اختیارات کے استعمال کا کوئی منطقی جواز نہیں مل سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باطنی منطق کے زیر اثر پروٹسٹنٹ فرقے کو مذہبی رواداری قبول کرنا پڑی۔ یہ وہ اصول ہے جسے کیتھولک فرقے نے کبھی نظری طور پر قبول نہیں کیا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ عارضی مصلحتوں کے باعث کیتھولک فرقے نے بھی مذہبی رواداری کے اصول کو عملی طور پر تسلیم کیا ہے۔ اس حوالے سے کیتھولک رویہ رومی شہنشاہ کی روایت کی نمائندگی کرتا ہے جبکہ پروٹسٹنٹ ازم نے حضرت عیسیٰ کے حواریوں اور عیسائیت کے ابتدائی داعیوں کی فرد پرستی سے رجوع کیا ہے۔

مذاہب کو یوں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے کہ ایک طرف تو ایسے مذاہب ہیں جو سیاسی ہیں اور دوسری طرف ایسے مذاہب ہیں جو انفرادی روح سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثال کے طور کنفیوشس کا مذہب سیاسی تھا۔ بہت سے شاہی درباروں میں گھومنے پھرنے کے باعث

http://muftbooks.blogspot.com/

بنیادی طور پر کنفیوشس کو حکومت کے مسئلے میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ وہ ایسی خوبیوں کی تعلیم دینا چاہتا تھا جو اچھی حکمرانی کو سہل بنا دیں۔ بدھ مت لازمی طور پر ایک غیر سیاسی مذہب ہے حالانکہ شروع شروع میں وہ بادشاہوں کا مذہب رہ چکا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمیشہ غیر سیاسی رہا ہے۔ چنانچہ تبت میں وہ پاپائیت کی طرح سیاسی ہے۔ جاپان میں مجھے ایسے بدھ زعما سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو برطانوی کلیسا کے اعلیٰ عہدے داروں کی یاد دلاتے تھے۔ اس کے باوجود بدھ مت کا کوئی پیروکار اپنے زیادہ مذہبی لمحات میں خود کو بالکل تنہا خیال کرتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام اپنے آغاز ہی سے سیاسی مذہب رہا ہے۔ بانیٔ اسلام نے اپنے آپ کو انسان کا حکمران بنایا اور پہلی جنگ عظیم تک ان کے جانشین خلاف کی بھی یہی کیفیت رہی۔ اسلام اور عیسائیت میں بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ خلیفہ کی ذات میں دینی اور دنیاوی دونوں قسم کا اقتدار شامل ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے نزدیک ان دونوں قسم کے اقتدار میں فرق بھی نہیں ہے جبکہ اپنی غیر سیاسی حیثیت کی بنا پر عیسائیت نے پوپ اور شہنشاہ کی صورت میں دو قسم کے رقیب سیاست دانوں کو جنم دیا۔ ان میں سے پوپ نے لادینی حکمرانی کو غیر اہم ٹھہراتے ہوئے دنیاوی اقتدار پر بھی دعویٰ جتایا۔ روس میں جس طرح کے کمیونزم کو فروغ حاصل ہوا، اس نے اسلام جیسے سیاسی مذہب کی صورت اختیار کر لی۔ تاہم وہ ناگزیر طور پر بازنطینی روایت سے متاثر ہوا ہے اور اس امر کا امکان موجود ہے کہ کیمونسٹ پارٹی چرچ کی جگہ لے لے اور دنیاوی حکومت کو مذہبی اقتدار سے اس قدر آزادی عطا کر دے جس قدر اشتراکی انقلاب سے پہلے اسے حاصل تھی۔ دوسرے امور کی طرح اس معاملے میں بھی روس مشرقی اور مغربی دو طرح کی ذہنیتوں میں منقسم ہے۔ جس حد تک روس ایشیائی ہے، اس حد تک کمیونسٹ پارٹی کی حیثیت خلافت جیسی ہے۔ دوسری طرف جس حد تک روس یورپی ہے، اس حد تک کمیونسٹ پارٹی کو چرچ کی حیثیت حاصل ہے۔

تاریخ مذاہب کے اس طرائرانہ جائزے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ موجودہ تعلیم کے جو عناصر انفرادی تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں، وہ زیادہ تر روایت کی پیداوار ہیں اور امکان یہ ہے کہ شہریت کی تعلیم ان کی زیادہ سے زیادہ جگہ لے لے گی۔ شہریت کی تعلیم اگر دانش مندانہ ہو تو وہ انفرادی تہذیب کے بہترین عناصر کو برقرار رکھ سکتی ہے لیکن اگر وہ

http://muftbooks.blogspot.com/

کوتاہ نظر ہوئی تو وہ فرد محض اس لیے برباد کر دے گی کہ اسے حکومت کا آسان آلہ کار بنایا جا سکے۔ لہٰذا یہ بات ضروری ہے کہ جب شہریت کے مقاصد کا تعین کوتاہ نظری سے کیا جائے تو پھر اس میں مضمر خطرات کا احساس بھی کر لیا جائے۔ تعلیم کے سرکاری نظاموں کے پالیسی سازوں کی پستی کا سبب بنیں گے۔ صرف وسیع تر انفرادی تہذیب وشائستگی کے حامل صاحبان ہی یہ سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں کہ انفرادی تہذیب شہریت کو کیا کچھ عطا کر سکتی ہے۔ یہ بدقسمتی ہے کہ آج کے زمانے میں انتظامی اہلیت کے حامل افراد یا محض سیاستدان، جن کو خدمات کا صلہ دینا مقصود ہو، اس قسم کے صاحبان کی جگہ لیتے جا رہے ہیں۔

اچھے شہری پیدا کرنے کا مقصد رکھنے والی تعلیم کی دو بہت مختلف صورتیں ممکن ہیں۔ ایک وہ جس کا مقصد موجودہ نظام کی تائید کرنا اور دوسری وہ جس کا مقصد اس کا تختہ الٹنا ہے۔ تعلیم میں ریاست کی اہمت کے پیش نظر یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ تعلیم کا کم وبیش ہمیشہ ہی یہ مقصد ہوگا کہ موجودہ نظام کی تائید وحمایت کی جائے۔ تاہم معاملہ یہ نہیں ہے۔ روس کے سوا اشتراکیوں کو جہاں بھی اقتدار حاصل ہوا ہے، وہاں مذہب اور درمیانے طبقے کا اثر ورسوخ اس قدر ضرور ہے کہ وہ تعلیم کے بیشتر حصے کو رجعت پسندانہ رکھ سکے۔ دوسری طرف انقلاب فرانس اور اسی طرح انقلاب روس سے پہلے تعلیم اگرچہ عام نہ تھی، لیکن اپنی نوعیت کے اعتبار سے زیادہ تر حکومت کے خلاف تھی۔ امریکہ کے زیادہ پسماندہ علاقوں میں آج بھی یہی رجحان دکھائی دیتا ہے۔ کم وبیش غیر ارادی طور پر امریکہ کی ریاستی یونیورسٹیاں ایسے نظریات کی تعلیم دینے کا رجحان رکھتی ہیں جو ان بے خبر کسانوں کے حسب حال نہیں ہیں جن کے ادا کردہ ٹیکسوں کے سہارے یہ یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ قدرتی طور پر کسان سوچتے ہیں کہ جو کوئی نے نواز کو بلاتا ہے، نے کا تعین بھی وہی کرتا ہے۔ یونیورسٹیوں کے معاملے میں صورت حاصل کو مختلف پا کر انہیں کوفت ہوتی ہے۔

خیر، ان مستثنیات کے باوجود دنیائے جدید میں تعلیم ایک رجعت پسند قوت ہے۔ حکومت قدامت پسند ہو تو وہ اس کی حمات کرتی ہے اور اگر حکومت ترقی پسند ہو تو وہ اس کی مخالفت کرتی ہے۔ یہ بھی بدقسمتی کی بات ہے کہ سکولوں اور یونیورسٹیوں میں اچھے شہری کے جن عناصر پر زور دیا جاتا ہے، وہ بہترین ہونے کے بجائے بدترین ہیں۔ سب سے زیادہ زور ایک جارحانہ قسم کی وطن پرستی پر دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ باقی تمام علاقوں کے لوگوں کے مقابلے میں ایک مخصوص علاقے کے لوگوں سے تنگ نظر وابستگی

http://muftbooks.blogspot.com/

رکھی جائے اور منتخب علاقے کے لوگوں کے مفادات کو فروغ دینے کے لیے فوجی قوت کے استعمال سے بھی دریغ نہ کا جائے۔ جہاں تک داخلی امور کا تعلق ہے شہریت، جیسا کہ عموماً اس کی تعلیم دی جاتی یہ، روایتی اکثریت نے سرمایہ داروں کی حمایت کرنے کو حب الوطنی کا تقاضا سمجھا تھا۔ ان میں سے شاید ہی کسی کی تعلیم اس طرح ہوئی تھی کہ وہ ہڑتالی محنت کشوں کے نقطۂ نظر سے اس معاملے کو دیکھنے کے قابل ہو سکے۔

جہاں کہیں ناانصافی موجود ہے، اس کی تائید میں ضابطہ و آئین پرستی کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ روس کے سوا باقی تمام ملکوں میں معلمین یا تو جسمانی ساخت کے اعتبار ہی سے بزدل ہوتے ہیں یا پھر اپنی آمدنی یا امارت پرستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر کرامرا کے حمایتی ہوا کرتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ان کی تعلیم قانون و آئین کی اہمیت پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کا رجحان رکھتی ہے، حالانکہ قانون و آئین دونوں ماضی کو حال پر مفلوج کر دینے والی گرفت عطا کرتے ہیں۔ اس زائد از ضرورت اصرار کے خلاف ردعمل کے طور پر دنیا میں بنیادی تبدیلی لانے کے خواہش مند مجبوراً انقلابی بن جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسی انقلابی کے ذہن میں بھی فرض کا وہی تصور ہو جو قانون اور نظم و ضبط کی وکالت کرنے والے کے تصور کی طرح محدود ہو اور جو بالآخر ویسا ہی خطرناک بھی ہو۔

خیر، بعض امور ایسے بھی ہیں جن میں یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ تبدیلی کے حامی جمود پرستوں کے مقابلے میں بہتر تعلیم مہیا کریں گے۔ پرانے اور بوسیدہ طور طریقوں کو پسند کرنے کے لیے محض حیوانی عادت ہی کافی ہے، ویسے ہی جیسے سڑک پر روزمرہ کے موڑ پر پہنچ کر گھوڑا خود بخود ہی مڑ جایا کرتا ہے۔ قدامت پرستی کے لیے کوئی اعلیٰ تر ذہنی عمل درکار نہیں ہوتا۔ تبدیلی کے حامی کا معاملہ البتہ اور ہے۔ اسے خاص حد تک قوت تخیل کا حامل ہونا ضروری ہے تاکہ وہ بنی بنائی راہ سے ہٹ کر کچھ سوچ سکے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اقدار کے نقطۂ نظر سے حال کو جانچنے کی کسی قدر صلاحیت رکھتا ہو۔ علاوہ ازیں چونکہ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ حالات کو جوں کا توں رکھنے کے حامی بھی موجود ہیں، لہٰذا اسے یہ احساس بھی ہونا چاہیے کہ کم از کم دو ایسے نقطۂ ہائے نگاہ موجود ہیں جن کو کوئی معقول شخص اختیار کر سکتا ہے۔ مزید براں وہ اپنے آپ کو موجودہ ظلم و زیادتیوں کا شکار

http://muftbooks.blogspot.com/

ہونے والوں کے لیے اپنی ہمدردی کے دروازے بند کرنے پر مجبور نہیں پاتا۔ اسے یہ ضرورت بھی نہیں ہوتی کہ وہ ایسے مصائب کو ختم نہ کرنے کے حق میں دلائل گھڑتا رہے جن کو آسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جو تعلیم جمود پرستی کے خلاف ہو، وہ جمود پرستی کی تائید کرنے والی تعلیم کے مقابلے میں ذہانت اور ہمدردی کو کم نقصان پہنچاتی ہے۔

بہرحال اس معاملے کی بھی چند حدود ہیں۔ موجودہ نظام کی مخالفت دو میں سے کسی ایک ذریعہ سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اول یہ کہ وہ بدنصیبوں کے ساتھ ہمدردی سے پیدا ہو سکتی ہے اور دوئم یہ کہ وہ خوش نصیبوں سے نفرت سے جنم لے سکتی ہے اگر مخالفت دوسرے ذریعے سے پیدا ہو تو اس میں ہمدردی اتنی ہی محدود ہوتی ہے جتنی کہ قدامت پسندی میں مضمر ہوتی ہے۔ اپنے خیالات کی دنیا میں بہت سے انقلابیوں کو عوام کو ملنے والی خوشیوں سے اتنا سروکار نہیں ہوتا جتنا ان کو اس بات کا خیال ہوتا ہے کہ انقلاب برپا ہونے کے بعد وہ ان صاحبان اقتدار سے انتقام لے سکیں گے جو ان کے موجودہ مصائب کے ذمہ دار ہیں۔ یہ بھی ہے کہ عقلی اعتبار سے تبدیلی کے حامیوں میں گروہ بندی کا رجحان پایا جاتا ہے۔ یہ گروہ بندی تنگ نظری اور نفرت کی اساس پر معرض وجود میں آتی ہے، عقیدہ پرستی جیسی بھی ہو وہ ذہانت کی موت ہے۔ اس معاملے میں انقلابیوں کی عقیدہ پرستی کسی طور پر بھی رجعت پسندوں ک عقیدہ پرستی سے بہتر نہیں۔

انفرادی تہذیب اور شہریت کی تنگ نظر، تعلیم میں پائے جانے والے اہم ترین اختلافات میں سے ایک کا تعلق مشکوک سوالات سے متعلق سائنسی رویئے سے ہے۔ سائنس نے ایک خاص طریقہ کار کو فروغ دیا ہے جو بنیادی طور پر دریافت، یعنی تبدیلی کا طریقہ کار ہے۔ عمومی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سائنسی رویہ وہ ہے جو دریافت کے لیے راہ ہموار کرتا ہے نہ کہ وہ جو انسان کو سائنس کے موجودہ نظریات پر غیر متزلزل ایمان رکھنے پر آمادہ کرتا ہے۔ تعلیم یافتہ شہری عموماً دریافت کاری کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ بزرگوں اور بہتر لوگوں کا عقیدت مند ہوتا ہے اور موجودہ نظام کو درہم برہم کرنے والے تمام نظریوں سے خوف زدہ ہوتا ہے۔ جدید ریاست، جس کی اساس سائنس پر رکھی گئی ہے، اپنے آپ کو مشکل میں پاتی ہے۔ بعض ریاستیں ایسی ہیں جو ایسے غیر مقلد لوگوں کو پسند کرتی ہیں جو تباہ کاری کا نیا ساز و سامان تیار کر سکیں جبکہ دوسری ریاستوں کی

http://muftbooks.blogspot.com/

ترجیح یہ ہوتی ہے کہ ان کے نوجوان عقیدہ پرست رہیں اور ماضی کی عظیم روایات کا بوجھ اٹھائے رکھیں۔ ایک زمانہ تھا کہ جب بازنطینی لوگ مغربی دنیا کو چند مذہبی رعایتیں دے کر اس کی امداد حاصل کر سکتے تھے لیکن اس کے برخلاف انہوں نے اپنے عقیدوں کی حفاظت کو ترجیح دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں ترکوں کے ہاتھوں شکست اٹھانا پڑی۔

ہمارے عہد کے تضادات میں سے ایک یہ ہے کہ سائنس جو قوت اور خاص طور پر سرکاری قوت کا وسیلہ ہے، اس کی پیش رفت کا انحصار تحقیق کار کے ذہن کی نراجی کیفیت پر ہے۔ سائنسی ذہن کا معاملہ یہ ہے کہ وہ شک پرست ہوتا ہے اور عقیدہ پرستی پر مائل نہیں ہوتا۔ شک پرست کے نزدیک سچائی کو دریافت نہیں کیا جا سکتا، جبکہ عقیدہ پرست سمجھتا ہے کہ سچائی کو پہلے ہی دریافت کیا جا چکا ہے۔ ان دونوں کے برخلاف سائنس دان کا نقطۂ نظر یہ ہوتا ہے کہ کم از کم ان امور میں جن میں وہ تحقیق کر رہا ہے، اگر حقیقت پہلے سے معلوم نہیں ہو چکی تو وہ قابل علم ضرور ہے۔ خیر یہ کہنا بھی کہ سچائی قابل علم ہے، سائنس دان کے رویہ سے انصاف کرنا نہیں ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ اپنی دریافتوں کو حتمی اور مطلق نہیں سمجھتا، بلکہ انہیں ایسے اندازے خیال کرتا ہے جن کی درستگی مستقبل میں ہو سکتی ہے۔ سائنس میں قطعیت جیسی کوئی شے نہیں۔ درحقیقت قطعیت کا فقدان سائنسی رویئے کی روح ہے۔ لہٰذا سائنس دان کے اعتقادات عارضی ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں جہاں تک یہ اعتقادات سائنس دان کی اپنی تحقیقات کا ثمر ہوتے ہیں، اس حد تک ان کی حیثیت اجتماعی کے بجائے شخصی ہوتی ہے۔ ان کا انحصار سائنس دان کے اپنے مشاہدے اور منطق کے نتائج پر ہوتا ہے نہ کہ اس بات پر کہ معاشرے کے نزدیک کسی اچھے شہری کو کن باتوں میں ایمان رکھنا چاہیے۔ شاید سائنسی رویئے اور حکومت کی طرف سے سائنس کا استحصال کے مابین پایا جانے والا یہ تضاد آخر کار سائنسی ترقی کی راہ ہی مسدود کر دے گا، کیونکہ سائنسی طریقہ کار کو راسخ الاعتقادی اور ایمان کی تلقین و اشاعت کے لیے زیادہ سے زیادہ بروئے کار لایا جانے لگے۔ اس صورت حال سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ جو بچے ایک خاص حد تک سائنس کی طرف میلان ظاہر کریں، انہیں شہریت کی تعلیم سے مستثنیٰ کر دیا جائے اور انہیں سوچ بچار کی آزادی مہیا کی جائے۔ امتحانات میں ایک خاص حد تک پہنچنے والوں کو اپنے نام کے آگے

http://muftbooks.blogspot.com/

''س آ'' کے حروف کا اضافہ کرنے کی اجازت دی جائے جن کا مطلب ''سوچنے میں آزاد'' ہوگا۔ بعد ازاں ان میں سے کسی شخص کو کسی عہدے سے محض اس لیے الگ نہ کیا جائے گا کہ وہ اپنے افسروں کو احمق سمجھتا ہے۔

زیادہ سنجیدگی سے کام لیتے ہوئے ہم یہ کہیں گے کہ صداقت کا پورا تصور ایسا ہو کہ اسے شہریت کے عمومی نصب العینوں سے ہم آہنگ نہیں کیا جا سکتا۔ پریگمیٹک (Pragmatic) فلسفیوں کی طرح بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنی روایتی صورت میں صداقت کے تصور کا کوئی جواز نہیں اور یہ کہ سچائی کا معیار سہولت ہوتا ہے۔ اب اگر معاملہ یہی ہے تو پھر سچائی کا تعین پارلیمنٹ کے ایکٹ کے ذریعے بھی ہوسکتا ہے۔

دنیا بھر کی حکومتیں ایسی سچائیوں کو چھپانے کے جتن کرتی ہیں جن کو وہ ناپسندیدہ خیال کرتی ہیں اور ان لوگوں کو مختلف سزائیں دیتی ہیں جو ایسا علم پھیلاتے ہیں جن کو عوام کے لیے برا سمجھا جاتا ہے۔ علم کی جس قسم کو باغیانہ یا فحش قرار دیا جاتا ہے، اس پر اس اصول کا خاص طور پر اطلاق ہوتا ہے۔ یہاں میں اس کی مثالیں پیش نہیں کروں گا کیونکہ خود مجھے قانون کی زد میں آجانے کا خدشہ ہے۔

مہذب زندگی کی سہولتوں کا دارومدار تعاون پر ہے۔ صنعتکاری ہونے والے ہر اضافہ تعاون کو بڑھانے کا تقاضا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر انقلاب چین سے پہلے اس ملک میں خوش حال اور اعلیٰ تمدن کے تمام ضروری وسائل موجود تھے۔ بس کمی تھی تو ایک مضبوط مرکزی حکومت کی۔ اسی طرح سپین اور پرتگال سے آزادی حاصل کرنے کے بعد سے لاطینی امریکہ کا براعظم اپنے باشندوں کے نراجی رجحانات کے باعث پسماندہ رہ گیا ہے۔ اس امر کی کسی قدر شہادت دستیاب ہے کہ امریکہ بھی لاطینی امریکہ کے نقش قدم پر چلنے کی تیاری کر رہا ہے۔ یہ امر طے شدہ ہے کہ آج کل امریکہ کو جو سب سے بڑا خطرہ درپیش ہے وہ یہ ہے کہ اس کے باشندوں کی بھاری اکثریت شہریت کے کسی واضح احساس سے محروم ہے۔ وجہ اس کی یہ نہیں کہ امریکی تعلیم میں شہریت پر توجہ نہیں دی جا رہی۔ صورت حال اس کے برعکس ہے۔ چنانچہ پبلک سکولوں سے لے کر یونیورسٹیوں کی سطح تک امریکہ کا پورا تعلیمی نظام شہریت پر زور دینے اور نوجوان ذہنوں پر اس کے فرائض مثبت کرنے کے درپے ہے۔ اس ساری تگ ودو کے باوجود ایک عام امریکی، یا تو ابتدائی روایت کے زیر

http://muftbooks.blogspot.com/

اثر یا پھر اس وجہ سے کہ اس کے قریبی زمانے کے آباؤ اجداد یورپی تھے، اس جبلی سماجی احساس کو حاصل نہیں کرتا، امریکہ کے پورصنعتی نظام کے درہم برہم ہونے کا خطرہ بھی موجود رہے گا۔

اگر ہماری سائنسی تہذیب کی بقا مقصود ہے تو پھر نہ صرف مملکت کے اندر قومی یکجہتی، جس کے حصول کے لیے اس زمانے میں ریاستی تعلیم نظام کوشاں ہیں، ضروری ہے، بلکہ بین الاقوامی یکجہتی اور تمام نسل انسانی کی وحدت کا احساس پیدا کرنا بھی بتدریج اہم ہوتا جارہا ہے۔ میرے خیال میں ہماری تہذیب کی بقا، کم ازکم شرط کے طور پر، ایک عالمی ریاست اور اس کے نتیجے میں ایک ایسے عالمگیر تعلیمی نظام کے ادارے کے قیام کا تقاضا کرے گی جس کا مقصد عالمی ریاست سے وفاداری کا جذبہ پیدا کرنا ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم کا ایسا کوئی نظام، کم ازکم ایک دوصدیوں تک، ایسے ناموافق امور کو شامل حال رکھے گا جو انفرادی نشوونما کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوں گے لیکن اس کی متبادل صورت انتشار اور تہذیب کی موت ہے۔ لہٰذا تہذیب کے بقا کی خاطر ہمیں ان رکاوٹوں کو برداشت کرنا ہی ہوگا۔ معاشی اور سیاسی اعتبار سے جدید معاشرے ماضی کے معاشروں کے مقابلے میں زیادہ مربوط ہیں۔ ان کی کامیابی کا دارومدار انفرادی عورتوں اور مردوں میں شہریت کے احساس میں مساوی اضافے پر ہے۔ یقیناً عالمی ریاست سے وفادی موجودہ ریاستوں سے وفاداری کے بدترین پہلوؤں سے محفوظ ہوگی۔ یعنی اس میں جنگ کی حوصلہ افزائی کا عنصر شامل نہ ہوگا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ وہ علمی اور جمالیاتی امنگوں کو کافی حد تک کم کر دے۔ اس کے باوجود میرا خیال تو یہی ہے کہ مستقبل قریب کی اہم ترین ضرورت یہ ہوگی کہ دنیا کا شہری ہونے کے واضح احساس کو پیدا کیا جائے۔ جب ایک واحد معاشی اور سیاسی وحدت کے طور پر دنیا محفوظ ہو جائے تو پھر انفرادی تہذیب کا احیا بھی ممکن ہو سکے گا لیکن اس وقت کے آنے تک ہماری پوری تہذیب خطرے کی زد میں رہے گی۔ میرے نزدیک فرد کی تعلیم شہری کی تعلیم کے مقابلے میں اعلیٰ ترشے ہے لیکن وقت کے تقاضوں کے حوالے سے سیاسی طور پر دیکھا جائے تو مجھے خدشہ ہے کہ ہمیں شہری کی تعلیم کو اولیت دینی ہوگی۔

http://muftbooks.blogspot.com/

دوسرا باب

تعلیم کا منفی نظریہ

قریبی زمانے تک شاید ہی کسی کو اس بارے میں شبہ تھا کہ تعلیم کا کام بچے کو وہ تربیت دینا ہے جس کے مطابق اس کو زندگی بسر کرنی ہے۔ اسے اخلاقی اصولوں، محنت و مشقت کی عادات اور اس کے سماجی مقام کے حوالے سے علم کی کچھ مقدار مہیا کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ تعلیم دینے کے طریقے بھی بہت سیدھے سادھے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ طریقے گھوڑوں کی تربیت کے طریقوں سے زیادہ مختلف نہ تھے۔ گھوڑے کو سدھانے لیے اگر چابک سے کام لیا جاتا تھا تو بچے کی تربیت کے لیے چھڑی استعمال کی جاتی تھی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اپنے بھدے پن کے باوجود اس نظام نے مجموعی طور پر مطلوبہ نتائج پیدا کئے تھے۔ اگرچہ اس زمانے میں صرف ایک چھوٹی سی اقلیت ہی تعلیم حاصل کرتی تھی، لیکن اس اقلیت میں مخصوص عادات — جیسے ضبطِ نفس، سماجی ہم آہنگی، قیادت کی صلاحیت اور انسانی ضروریات کو نظر انداز کرنے والی روشنی — راسخ ہو جایا کرتی تھیں۔ اس نظام نے برطانیہ کو عظمت سے ہمکنار کیا اور برطانوی تہذیب کو ہندوستان اور افریقہ کے دور دراز علاقوں تک پھیلا دیا۔ میں اس کامیابی کی اہمیت کو کم نہیں کرنا چاہتا اور مجھے یقین نہیں کہ اتنی تھوڑی محنت صرف کر کے کسی اور طریقے کی مدد سے یہ کامیابی حاصل کی جا سکتی تھی۔ اس نظام نے سخت کوشی کی عادات کو راسخ کر کے اور ذہنی شکوک و شبہات کی اہلیت کو ختم کر کے ایسے افراد تیار کئے جو پسماندہ اقوام پر حکومت کرنے کے لیے حکمران قوم کو درکار تھے۔ وہ اس سخت نظم و ضبط کو رائج کرنے کے قابل تھے جس کے تحت خود ان کی زندگی کا ابتدائی حصہ بسر ہوا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اس احساس سے بھی محفوظ رہے کہ جس شے کو وہ اپنی تعلیم خیال کرتے تھے، اس سے ان کی قوت ارادی

http://muftbooks.blogspot.com/

کو مضبوط کرنے کی خاطر ان کی ذہانت اور جذبوں کو کچل دیا تھا۔ امریکہ میں یہی نتائج پیورٹن تحریک کی مدد سے اس کے دورِ عروج میں حاصل کئے گئے۔

رومانوی تحریک بنیادی طور پر جذبوں کے نام پر قوت ارادی کی سابقہ ناموزوں اہمیت کے خلاف احتجاج کی حیثیت رکھتی تھی۔ بہت چھوٹے بچوں کے ساتھ سلوک کے معاملے میں اس تحریک نے کسی قدر اثر ڈالا۔ لیکن زیادہ تر تعلیمی حکام اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہونے والے تھے۔ صرف ہمارے اپنے زمانے میں ہی یہ ہوا ہے کہ زندگی سے متعلق ان کا عمومی رویہ تعلیمی نظریئے پر حقیقی معنوں میں کوئی اثر ڈالنے لگا ہے۔ تاہم جس طرح معیشت میں عدم مداخلت کی پالیسی نے منظّم منصوبہ بندی کی نئی اقسام کے لیے جگہ خالی کر دی ہے، اسی طرح تعلیم کے شعبے میں عدم مداخلت کی پالیسی، ایک ضروری مرحلہ رہتے ہوئے بھی، میرے خیال میں قطعی اور حتمی پالیسی نہیں رہا۔ ہم اس باب میں ایسی پالیسی کے حق میں کچھ کہیں گے اور پھر اس کی حدود کا تجزیہ کریں گے۔

تعلیم کے شعبے میں زیادہ سے زیادہ آزادی مہیا کرنے کا نقطۂ نظر ٹھوس دلائل کا حامل ہے۔ ہم اس بات سے آغاز کر سکتے ہیں کہ آزادی موجود نہ ہو تو پھر بالغوں کے ساتھ تصادم پیدا ہوتے ہیں۔ عام طور پر سختی کے نفسیاتی اثرات اس سے کہیں زیادہ گہرے ہوتے ہیں جتنے کہ حالیہ زمانے تک سمجھا جاتا تھا۔ ہوتا یہ ہے کہ جس بچے پر سختی کی جائے، اس میں نفرت کا جذبہ پروان چڑھنے لگتا ہے۔ اگر وہ نفرت کا اظہار نہ کر سکے تو وہ اندر ہی اندر بڑھتی رہتی ہے اور اس کی پوری زندگی میں زہر گھول دیتی ہے۔ چنانچہ بچے کو اکثر نفرت باپ سے ہے تو پھر آگے چل کر وہ ملک، مذہب یا کسی غیر قوم کے خلاف نفرت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یوں وہ انتشار پسند، لامذہب یا انتہا پسند بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب بچپن میں کسی شخص پر سختی سے کام لیا جائے تو بڑا ہونے پر وہ خود بھی نئی نسل کے ساتھ سختی سے کام لینے کی خواہش کرنے لگتا ہے۔ یہ نہ ہو تو عام سا چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں خوش گوار سماجی اور ذاتی تعلقات سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت تباہ ہو جاتی ہے۔ ایک دن میں نے سکول میں درمیانے قد کے ایک بچے کو اپنے سے چھوٹے بچے کے ساتھ بدسلوکی کرتے دیکھا۔ جب میں نے اسے ڈانٹا تو اس کا جواب یہ تھا کہ ''بڑی عمر کے لڑکے مجھے مارتے، ہیں اس لیے میں بھی چھوٹوں کو مارتا ہوں۔ یہ

http://muftbooks.blogspot.com/

مناسب بھی ہے۔'' سچ تو یہ ہے کہ اس لڑکے نے ان چند لفظوں میں نسل انسانی کی ساری تاریخ کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔

تعلیم میں جبر کا ایک اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے کی اپج اور ذہنی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔نوجوانوں میں علم— کم از کم اچھے خاصے علم— کی فطری خواہش موجود ہوتی ہے۔ لیکن جب ان پر خواہش سے زیادہ یا ان کی صلاحیت سے زیادہ علم ٹھونسنے کی کوشش کی جائے تو ان کی فطری خواہش بھی تباہ ہو جاتی ہے۔جن بچوں کو زبردستی کھانے پر مجبور کیا جائے وہ روٹی سے بھاگنے لگتے ہیں۔اسی طرح جن بچوں کو زبردستی پڑھنے پر مجبور کیا جائے وہ پڑھائی سے دور بھاگنے لگتے ہیں۔ جب وہ سوچتے ہیں تو ان کی سوچ فطری اور بے ساختہ نہیں ہوتی۔اس کے بجائے وہ محض اس لیے سوچتے ہیں کہ بڑوں کو خوش کر سکیں۔گویا ان کی سوچ فطری تجسس سے پیدا نہیں ہوتی۔ بے ساختگی کا خاتمہ خاص طور پر فن کارانہ اور تخلیقی امور پر نقصان دہ ہوتا ہے۔جن بچوں کو اپنی ذات کے اظہار درستی پر نظر رکھتے ہوئے ادب، مصوری یا موسیقی کی تعلیم دی جاتی ہے، وہ زندگی کے جمالیاتی پہلو سے بتدریج بددل ہوتے چلے جاتے ہیں۔اسی طرح تربیت پر ضرورت سے زیادہ زور دینے سے مشینی ایجادات میں بھی بچے کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے اگر آپ کسی بچے کو سبق کے دوران عام پمپ کے اصول سکھانا شروع کر دیں تو وہ اس علم سے جان چھڑانے کی کوشش کرے گا۔اس کے بجائے اگر آپ کے صحن میں پمپ نصب ہے اور آپ بچے کو اس کے قریب جانے سے منع کر دیتے ہیں تو پھر وہ فرصت کا سارا وقت اس پر سوچ بچار کرتا رہے گا۔اس قسم کی بہت سے دقتیں سبق کو اختیاری کر دینے سے دور ہو سکتی ہیں۔نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ استاد اور شاگرد میں کھچاؤ ختم ہو جائے گا اور اکثر طالب علم استاد سے حاصل ہونے والے علم کی قدر کرنے لگیں گے۔ان کی پیش رفت کی خواہش برقرار رہے گی کیونکہ پڑھنے کا کام ان کا اپنا انتخاب بن جائے گا اور ان کے لاشعور میں نفرت کا انبار جمع نہ ہوگا۔تقریر کی آزادی، سماجی آداب کے بوجھ سے آزادی اور جنسی علم کے حصول میں آزادی کے حق میں دلائل اس سے بھی زیادہ وزنی ہیں جن پر ہم بعد میں بحث کریں گے۔

ان تمام وجوہ کی بناء پر تمام تعلیمی مصلحین مدرسوں میں زیادہ سے زیادہ آزادی مہیا کرنے کا رجحان رکھتے ہیں۔میرے خیال میں وہ حق بجانب بھی ہیں۔تاہم میرا خیال

http://muftbooks.blogspot.com/

نہیں کہ مدرسے میں آزادی کو ایک قطعی اصول کی صورت دی جا سکتی ہے۔ اس کی کچھ حدود ہیں اور ان حدود کو جاننا ضروری ہے۔

واضح ترین مثالوں میں سے ایک کے طور پر ہم صفائی کے مسئلے کو لے سکتے ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ آسودہ حال والدین کے بچوں کو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی صاف ستھرا رکھا جاتا ہے۔ والدین اپنے اس رویئے کا جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ صفائی صحت کے لحاظ سے ضروری ہے۔ خیر، یہ بات تو درست ہی ہے لیکن اس پر زیادہ زور دینے کا محرک امارت کے اظہار کا جذبہ ہے۔ جب آپ دو ایسے بچوں کو دیکھیں جن میں ایک صاف ستھرا اور دوسرا گندا ہو تو فوراً ہی آپ کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ گندے بچے کے مقابلے میں صاف ستھرے بچے کے والدین زیادہ امیر ہیں۔ یہی ہے وہ بات جس کے لیے امارت پسند والدین اپنے بچوں پر صفائی کے سلسلے میں سختی کرتے ہیں۔ یہ جبر قابل نفرت ہے اور وہ بچوں کو ایسی بہت سی باتوں سے روک دیتا ہے جو انہیں کرنی چاہئیں۔ صحت کے نقطۂ نظر سے یہ بات مناسب ہے کہ دن میں دو بار بچوں کو صاف ستھرا بنایا جائے — یعنی صبح کے وقت اور پھر رات کو سونے کے وقت — ان دو تکلیف دہ لمحات کے درمیان جو وقت ہے، اس میں انہیں آزادی ہونی چاہیے تاکہ وہ خوب کھیلیں کودیں، کپڑے گندے کریں اور چاہیں تو کیچڑ سے لتھڑے ہاتھ منہ پر ملیں۔ بچوں کو ان خوشیوں سے محروم کرنے کا مطلب ان کی پیش قدمی کی صلاحیت، جستجو کی خواہش اور بھاگ دوڑ کی عادت کو کچلنا ہے۔ یہ باتیں اپنی جگہ درست ہیں، تاہم جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں صبح شام صفائی کی بھی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ اس صفائی کی خاطر بچے کے ساتھ سختی سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ گرم ملکوں میں اس کا زیادہ مسئلہ نہیں ہوتا کہ وہاں زیادہ کپڑے نہیں پہنے جاتے اور جسم کو ٹھنڈا رکھنے کی خاطر بچے خود ہی پانی میں ہاتھ پاؤں مار لیتے ہیں جو ان کے صفائی کے لیے اکثر و بیشتر کافی ہوتا ہے۔ البتہ ٹھنڈے ملکوں میں صفائی کے لیے خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ دانتوں کی صفائی کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے۔ اگر ہم پرانے زمانے کے لوگوں کی طرح کچی خوراک کھانے والے ہوتے تو پھر دانتوں کو برش کرنے کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔ اب جب تک ہم پکے ہوئے کھانے کھانے کی غیر فطری عادت قائم رکھیں گے تو پھر ہمیں دانتوں کو برش کرنے کا غیر فطری کام بھی کرنا ہی ہوگا۔ ''فطرت کی طرف واپسی'' کے مسلک کو اگر صحت کے تقاضوں

http://muftbooks.blogspot.com/

سے ہم آہنگ کرنا مقصود ہے تو پھر اسے ہمہ گیر بنانا ہوگا۔ گویا ہمیں لباس اور پکے ہوئے کھانوں سے بھی ہاتھ کھینچنا ہوگا۔ تو جناب بات یہ ہے کہ اگر ہم اس حد تک آگے نہیں بڑھنا چاہتے تو پھر ہمیں اپنے بچوں کو بعض ایسی عادات سکھانی ہوں گی جو وہ اپنے طور پر نہ سیکھیں گے۔ لہٰذا صفائی اور حفظان صحت کے معاملے میں اگرچہ موجودہ روایتی تعلیم نے بچوں کی آزادی کو ضرورت سے زیادہ محدود کر رکھا ہے، لیکن صحت کے نقطۂ نظر سے کسی نہ کسی حد تک پابندی ناگزیر ہی ہے۔

وقت کی پابندی ایسی ہی ایک اور معمولی خوبی ہے جو مکمل طور پر آزاد تعلیم سے شاید پیدا نہ ہو سکے۔ یہ ایسی خوبی ہے جس کی ضرورت سماجی تعاون سے منضبط ہے۔ اس کا خدا سے، کسی صوفیانہ بصیرت سے یا ایسے ہی کسی دوسرے معاملے میں کوئی تعلق نہیں جس میں بلند پایہ صاحبان یا روحانیت پرستوں کو دلچسپی ہوتی ہے۔ اگر ہم کسی درویش کو شراب نوشی کرتے دیکھیں تو ہمیں حیرت ہوگی۔ لیکن اگر وہی درویش کسی جگہ طے شدہ وقت پر نہ پہنچ سکے تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود زندگی کے روزمرہ امور پر وقت کی پابندی بے حد ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ زندگی کا کاروبار اس وقت نہیں چل سکتا جب کوئی انجن ڈرائیور یا ڈاکیہ اپنا کام محض اس وقت کرے جب اسے باطنی اشارہ ملے۔ جدید معاشی اداروں کے کارکن اپنے کام پر تاخیر سے پہنچنے لگیں تو ان اداروں کا سارا کام ہی ٹھپ ہو جائے۔

یہ بجا سہی، لیکن وقت کی پابندی کی عادتیں آزاد ماحول میں سیکھنا دشوار ہی ہے۔ اپنے موڈ کا غلام شخص بھی یہ عادتیں نہیں سیکھ سکتا۔ شاید اسی لیے یہ عادتیں خود کو اعلیٰ ترین کامیابیوں سے ہم آہنگ نہیں کر سکیں۔ نیوٹن کا حال ہم جانتے ہیں کہ وہ کھانے کے معاملے میں اکثر وقت کی پابندی کا خیال نہ کرتا تھا۔ چنانچہ ہوتا یہ تھا کہ کتاب نیوتن کا کھانا کھا جاتا اور اسے پتہ بھی نہ چلتا۔ اکثر شعبے ایسے ہیں کہ ان میں اعلیٰ ترین کامیابیاں حاصل کرنے کی خاطر اپنی کسی کیفیت میں گم ہونا پڑتا ہے۔ تاہم حکمرانوں سے لے کر نچلے درجے تک کے جن لوگوں کے کام اس قدر مہارت اور یکسوئی کا تقاضا نہیں کرتے، وہ اگر وقت کے پابند نہ ہوں تو بہت سا نقصان ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر ہمیں بچوں کو جدید زندگی کے کسی عام شعبے کے لیے تیار کرنا ہے تو پھر انہیں وقت کی پابندی کرنے کی عادت بھی سکھانا ہوگی۔

http://muftbooks.blogspot.com/

البتہ جو بچے شاعر، موسیقار یا ریاضی دان کے طور پر غیر معمولی صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں، ان کا معاملہ مختلف ہے۔ انہیں وقت کی پابندی کا درس نہ دینا چاہیے۔ تاہم انسانیت کے ننانوے فی صد حصے کو وقت کے معاملے میں نظم وضبط کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچوں کو اگر ان کی ترنگ پر چھوڑ دیا جائے تو وہ یہ نظم وضبط نہیں سیکھ سکتے۔ نئے شہروں کے باسی صبح آٹھ بج کر تر پن منٹ پر اپنے اپنے کام کاج کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں، جب کہ ہمارے خیال میں قدیم زمانے کا وحشی شکار کے لیے صرف اسی وقت تکلیف گوارا کرتا تھا جب اسے بھوک ستاتی تھی۔ اس لیے جو تعلیم اس وحشی کے لیے کافی ہو سکتی تھی، وہ آج کے انسان کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی۔

دیانت داری نسبتاً زیادہ سنجیدہ معاملہ ہے جس پر انہی باتوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس اصطلاح سے میری مراد کوئی ہوائی چیزیں نہیں ہیں۔ میرا مطلب تو دوسرے لوگوں کے مال ومتاع کا احترام ہے۔ انسانوں میں یہ احترام فطری طور پر موجود نہیں ہوتا۔ غیر منظّم اور غیر تربیت یافتہ شخص کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی موقع ہاتھ آئے وہ دوسروں کی چیزوں پر قبضہ جما لیتا ہے۔ شاید تربیت یافتہ شخص بھی اکثر ایسا ہی کرتا ہے۔ تاہم نظم وضبط نے اس پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ اکثر اوقات چوری خطرے سے خالی نہیں ہوتی اور اس کے قابو آ جانے کا امکان کافی ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ہمارے زمانے کے بعض انسان دوست لوگوں کے ذہن میں اس بارے میں ابہام پایا جاتا ہے۔ جب سے انہیں یہ معلوم ہوا ہے کہ چوری کرنے کی ایک نفسیاتی بیماری بھی موجود ہے، وہ تمام چوریوں کو اسی بیماری کا نتیجہ سمجھنے لگے ہیں، لیکن یہ بات غلط ہے۔ چوری کرنے کی نفسیاتی بیماری کی حالت میں مریض اکثر اوقات ایسی چیزیں چراتا ہے جن کی اسے کوئی حقیقی ضرورت نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں وہ چوری کرتے ہوئے زیادہ احتیاط سے کام بھی نہیں لیتا۔ اس کے اس فعل کے اسباب نفسیاتی ہوتے ہیں۔ وہ جانے بوجھے بغیر محبت یا کوئی جنسی اہمیت رکھنے والی اشیاء پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔ اس نفسیاتی مرض کا علاج کسی سزا کے ذریعے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے تو نفسیاتی فہم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف معمولی چوریاں کسی طور بھی ان جانے میں نہیں کی جاتیں۔ عام چور خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے ہیں۔ لہٰذا اگر ان پر واضح کر دیا جائے کہ ان کا یہ کام خود ان کے مفاد کے خلاف ہے تو انہیں چوری سے

http://muftbooks.blogspot.com/

روکا جا سکتا ہے۔ اگر بڑے لوگ بچوں کے کسی گروہ کو آزاد چھوڑ دیں اور ان میں سے کوئی بچہ چوری کرے، بشرطیکہ وہ ان میں سے سب سے بڑا نہ ہو، تو دوسرے بچے اسے بری طرح پیٹیں گے۔ بڑے یہ کہہ کر اس سزا سے دامن چھڑا سکتے ہیں کہ ان کے نظام میں کوئی تعزیری ضابطہ نہیں۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ خود فریبی کا شکار ہوں گے۔ اس امر کا امکان زیادہ ہے کہ بچوں کا گروہ بے ساختہ طور پر جو تعزیری ضابطے بنائے گا وہ بڑوں کے بنائے ہوئے ضابطے کے مقابلے میں زیادہ سخت اور کم قابل اعتماد ہوگا۔ لہٰذا خود چور کے لیے مجموعی طور پر بہتر بات یہ ہوگی کہ بالغ لوگ چوری کے واقعات کا محاسبہ کریں اور ایسے طریقے سے ان سے نمٹیں کہ ان کے حوالے سے دوسرے بچوں کو اپنا غصہ نکالنے کا موقع نہ ملے۔ دوسروں کے مال کا احترام conditioned reflex کو تخلیق کیے بغیر مشکل ہی سے سکھایا جا سکتا ہے۔ ترغیب اور لالچ کے زیر اثر چوری کرنے والے کو پکڑے جانے کا امکان اصل سے کم دکھائی دیتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جس شخص کے لیے چوری کرنے کا موقع موجود ہو وہ اس ترغیب کے دام میں پھنس جاتا ہے۔ اکثر اوقات وہ بالآخر قابو بھی آ جاتا ہے۔

میرے خیال میں ایک اور معاملہ ایسا ہے جس میں آزادی کے بہت سے علمبرداروں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ وہ معاملہ یہ ہے کہ نوجوانوں کی زندگی میں معمول یا روٹین کی اہمیت وہ مناسب طور پر محسوس نہیں کر سکے ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ روٹین کو بے لچک اور مطلق ہونا چاہیے۔ ایسے دن بھی زندگی میں ہونے چاہئیں جب روٹین کا چکر ٹوٹ جائے۔ مثلاً کسی تہوار کا دن ہے یا عام چھٹیوں کے دن ہیں۔ تاہم مناسب بات یہ ہے کہ بچے کو پہلے سے اس قسم کی تبدیلیوں کی توقع ہونی چاہیے۔ بے یقینی کی زندگی ہمیشہ ہی اعصاب پر برا اثر ڈالنے والی ہوتی ہے۔ نوجوانوں کے لیے تو وہ خاص طور پر نقصان دہ ہوگا کرتی ہے۔ آنے والے دنوں والی متوقع باتوں کا اگر بچے کو علم ہو تو وہ تحفظ محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنی دنیا کو محفوظ بنانا چاہتا ہے جو کسی ضابطے کے ماتحت ہو۔ ہم نے فطرت کی یکسانیت کا جو تصور قبول کر رکھا ہے وہ بھی بڑی حد تک ابتدائی عمر میں روٹین کی بچے کی خواہش کا کائنات پر اطلاق سے پیدا ہوا ہے۔ مہم جوئی اور جرات بہت زیادہ پسندیدہ صفات ہیں، لیکن وہ بھی بنیادی تحفظ کے پس منظر ہی میں پروان چڑھتی ہیں۔

http://muftbooks.blogspot.com/

روٹین پسندی کے حق میں ایک اور نکتہ یہ ہے کہ اگر بچوں کو ہر وقت اپنی مصروفیت کا انتخاب خود کرنا پڑے تو وہ پریشانی اور اکتاہت محسوس کرتے ہیں۔ وہ اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ اکثر اوقات دوسرے لوگ اس معاملے میں ان کی مدد کریں اور یہ کہ ان کا اپنا انتخاب محبت کرنے والے بالغوں کے طے کردہ دائرہ کار کے اندر رہے۔ بڑوں کی طرح بچے بھی کسی مشکل پر قابو پانے سے حاصل ہونے والی کامیابی کے احساس سے لطف اندوز ہوتے ہین۔ تاہم اس کام کے لیے مسلسل جدوجہد درکار ہوتی ہے اور دوسروں کی حوصلہ افزائی کے بغیر صرف چند بچے ہی اس قسم کی تگ و دو کر سکتے ہیں۔ استقامت سے اپنی راہ خود بنانے کی اہلیت بہت زیادہ قابل قدر ہے۔ چھوٹے بچوں میں یہ صلاحیت شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے۔ اب اگر انہیں سخت گیر قسم کے نظم و ضبط میں رکھا جائے یا مکمل آزادی مہیا کر دی جائے تو پھر یہ اہلیت کبھی پروان نہیں چڑھتی۔ ایسا بے سوچ ڈسپلن، جیسا کہ مثلاً جنگ کے زمانے میں سپاہیوں پر مسلط کیا جاتا ہے، وہ انسان کو بیرونی حکم کے بغیر از خود کوئی قدم اٹھانے کے نااہل بنا دیتا ہے۔ دوسری طرف بالپن کے پورے زمانے میں اگر بچے کو مکمل آزادی میسر رہے تو وہ کسی وقتی خواہش کی مزاحمت کرنے کی اہلیت حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اسی طرح وہ اس وقت کسی معاملے پر توجہ مرکز کرنے کی صلاحیت حاصل نہیں کر پاتا جب کہ اس کی دلچسپی کسی اور معاملے میں ہو۔ نہ ہی وہ اس لیے لذتوں کی مزاحمت کر سکتا ہے کہ وہ تھکاوٹ کا سبب بنیں گی جو کہ بعد کے فرائض پر اثر انداز ہوگی۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قوت ارادی کو مستحکم بنانے کی خاطر آزادی اور نظم و ضبط کی ایک لطیف آمیزش کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک زیادتی سے قوت ارادی کو ضعف پہنچتا ہے۔

ڈسپلن کی مناسب حدود کے تعین کی خاطر یہ بات اہم ہے کہ تمام ہنگامی ترنگوں کا نہ سہی، لیکن تمام تربیت کو بچے کے ارادے کا تعاون حاصل ہونا چاہیے۔ ہر وہ بچہ جسے ہمدرد بالغوں نے گھیر رکھا ہو، دل ہی دل میں محسوس کرتا ہے کہ وہ خود کسی حد تک احمق ہے اور وہ بڑی حد تک رہنمائی کے لیے ان لوگوں کا احساس مند ہوتا ہے جن پر وہ اپنی بھلائی کے لیے اعتماد کر سکتا ہے۔ کھلاڑی فطری طور پر ڈسپلن کو قبول کر لیتے ہیں۔ اسی طرح کھلاڑی کی کامیابی کی خواہش کی طرح جو بچے عقلی حاصلات کے خواہش مند ہوں وہ بھی

http://muftbooks.blogspot.com/

ضروری نظم وضبط کے آگے سر جھکانے پر رضامند ہوتے ہیں۔ تاہم اگر ماحول ایسا ہو کہ جہاں ہر قسم کے نظم وضبط کو بدی سمجھا جاتا ہو تو پھر بچے اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ کم وبیش ہر قسم کی کامیابی کے لیے رضاکارانہ طور پر ڈسپلن کی پابندیوں کو قبول کرنا ضروری ہے۔ اگر بچوں کو سرکش اور بے مقصد زندگی بسر نہیں کرنی تو ان کے ذہن میں مشکلات سے گھرا ہوا نصب العین موجود رہنا چاہیے۔ ایسے لوگوں کی تعداد کم ہی ہے جو مکمل زندگی کے ماحول میں اس قسم کا نصب العین چن سکیں۔

بچوں کی تعداد زیادہ نہ ہو اور وہ صحیح قسم کے بالغ کی نگرانی میں ہوں تو پھر ترغیب کے معاملے میں ڈانٹ ڈپٹ کی ضرورت تقریباً ختم ہوسکتی ہے۔ شفقت کے معاملے کو ہی لیجیے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وعظ ونصیحت یا ڈانٹ ڈپٹ سے سے کسی کو شفیق اور محبت کرنے والا بنایا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس طریقے سے اسے کھلم کھلا ظلم وتشدد سے روکا جا سکتا ہے۔ شفیق ذہن کی تیاری کے لیے ضروری ہے کہ جبلی مسرت کا جذبہ موجود ہو اور ساتھ ہی ساتھ بزرگوں کے شفقت آمیز برتاؤ کی مثال بھی موجود ہو۔ میرے خیال میں محض ایک اخلاقی اصول کے طور پر محبت وشفت کا درس دینا فضول ہی ہے۔

یہ بات بے حد اہم ہے کہ ڈسپلن جس قدر بھی ہو، وہ جذبات پر زیادہ دباؤ ڈالنے والا نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو بچہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اس پر بے جا پابندیاں عائد کی جا رہی ہیں تو پھر اس میں بہت سی ناپسندیدہ صفات پیدا ہونے لگتی ہیں۔ ان خصوصیات کا دارومدار بچے کے کردار کی مضبوطی پر ہوتا ہے۔ اگر وہ مضبوط ہے تو بچے ناراض باغی بن جائے گا اگر وہ کمزور ہے تو پھر رونے دھونے والا منافق بن جائے گا۔ لہٰذا ڈسپلن سے گویا ہم مکمل طور پر نجات حاصل نہیں کر سکتے تاہم اسے اس حد تک کم ضرور کرنا چاہیے جس حد تک شائستہ اور لائق انسانوں کی تربیت تقاضا کرے۔

تدریس کا معاملہ اس سارے سوال کا مشکل ترین حصہ ہے۔ کسی قدر تعجب کے ساتھ تجربے سے میں نے سیکھا یہ ہے کہ کلاس روم میں حاضری کی پابندی کے بغیر بھی کافی حد تک تعلیم دینا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تیار کرنا ممکن ہے۔ اس کے لیے حالات کا ایسا امتزاج درکار ہے جو آج کل وسیع پیمانے پر ممکن نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کے لیے طالب علموں میں علم کی سچی اور بے ساختہ جستجو ہونی چاہیے۔ کلاسیں چھوٹی ہونی چاہئیں اور

http://muftbooks.blogspot.com/

استاد میں ہمدردی، سلیقہ اور مہارت ہونی چاہیے۔ مزید برآں اس کے لیے ایک ایسا ماحول چاہیے جس میں اگر کوئی بچہ صرف شرارتیں کرنے کے لیے کلاس روم میں بیٹھا ہو تو استاد اسے وہاں سے نکال سکے اور کھیل کود کے لیے بھیج سکے۔ عام قسم کے سکولوں میں ایسے حالات پیدا کرنے کے لیے لمبا عرصہ درکار ہوگا۔ لہٰذا اکثر صورتوں میں کلاس میں حاضری غالباً ضروری ہونی چاہیے۔

بعض لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ اگر بچے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو پھر وہ اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہ جانے کے خوف سے خود ہی لکھنا پڑھنا سیکھ لے گا۔ اس لیے کلاس میں لازمی حاضری ختم کرنے سے زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ علم کے حصول میں ایک دو برس کی تاخیر ہو جائے گی۔ مجھے اس دلیل سے اختلاف ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں ہر دوسرا بچہ لکھنا پڑھنا سیکھتا ہو، وہاں تو یہ ممکن ہے کہ کوئی خاص بچہ جاہل رہ جانے کے خوف سے پیدا ہونے والے احساس کمتری سے نجات حاصل کرنے کی خواہش کرے۔ لیکن اگر حالات ایسے ہوں کہ تمام بچے ہی پابندی سے آزاد ہوں تو پھر اس قسم کے احساس کمتری پیدا ہونے کا موقع بھی نہ آئے گا۔ یوں ہر نسل اپنے بزرگوں کے مقابلے میں زیادہ جاہل ہوتی چلی جائے گی۔ مثلاً پہاڑے یاد کرنے کے مسئلے کو ہی لیجئے۔ چند بچے ایسے ہوتے ہیں جو انہیں یاد کرنے کی کوئی فطری خواہش رکھتے ہوں۔ جب ان کے ساتھیوں کو پہاڑے یاد کرنے پر مجبور کیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ وہ پیچھے رہ جانے کی شرم کا احساس کرتے ہوئے خود بھی انہیں یاد کرنے لگیں۔ اب اگر کسی معاشرے میں کسی بچے کو بھی پہاڑے یاد کرنے پر مجبور نہ کیا جائے تو پھر جلد ہی سوائے چند عالم فاضل لوگوں کے کسی کو خبر نہ رہے گی کہ چھ کو نوے سے ضرب دینے کیا حاصل ہوتا ہے۔

اکثر بچوں کو ٹھوس علم حاصل کرنا خوش گوار لگتا ہے۔ بچے کسی کھیت پر رہتے ہوں تو وہ کسان کے شب و روز کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اس کے کام کا علم حاصل کر لیتے ہیں۔ جہاں تک تجریدی علم کا تعلق ہے، وہ بہت کم بچوں کے دل کو بھاتا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تجریدی علم کے ذریعے ہی مہذب معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ لہٰذا مہذب معاشرے کو برقرار رکھنے کی خاطر ضروری ہو جاتا ہے کہ ایسے طریقے کو دریافت کیا جائے جس کی مدد سے بچوں میں ایک طرز عمل پیدا کیا جاسکے جو ان کے لیے فطری نہ ہو۔ ہم جبر کی ترغیب سے

http://muftbooks.blogspot.com/

کام تو لے سکتے ہیں، البتہ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کو فطرت کے سپرد کر دیا جائے۔ جدید معاشروں کی پیچیدگی کا شعور رکھنے والا کوئی شخص میرے خیال میں اس نظریئے کی تائید نہیں کر سکتا کہ تعلیم کا کام محض یہ ہے کہ وہ فطری نشو ونما کے مواقع فراہم کرے— جدید معاشروں کی اس پیچیدگی کو ہم افسوسناک قرار دے سکتے ہیں اور یہ خیال بھی کر سکتے ہیں کہ زندگی کے سادہ تر انداز کی طرف واپسی ہمارے لیے بہتر ہوگی تاہم بدقسمتی یہ ہے کہ اس قسم کی واپسی کے عمل میں انسانوں کی بہت بڑی تعداد فاقوں سے مر جائے گی۔ چنانچہ متبادل صورت اس قدر ہولناک ہے کہ عملی طور پر ہم سب جدید صنعتی دنیا کے پیچیدہ نظام سے چمٹے رہنے کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ اس صورت میں اپنے بچوں کی اس نظام کو جاری و ساری رکھنے کی تربیت دینا بھی ضروری ہے۔ لہٰذا عقلی وفنی تربیت کے حوالے سے ہم تعلیم کے منفی نظریئے کو مکمل طور پر قبول نہیں کر سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس نظریئے میں سچائی کے بہت سے اہم عناصر موجود ہیں اور جہاں تک جذبات کا تعلق ہے، یہ نظریہ بڑی حد تک درست بھی ہے۔ جدید زندگی کے تقاضوں کے پیش نظر ہمیں تعلیم کے اس منفی نظریئے کے بجائے کسی قدر زیادہ مثبت نظریئے کی ضرورت ہے۔

❁❁❁

http://muftbooks.blogspot.com/

تیسرا باب

تعلیم اور وراثت

ایک جواں پودے یا جانور کا کردار اس کی تخم ریزی کے لمحے سے ماحول اور گنزم (orgamism) کے مابین تال میل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ میں نے اپنے اس بیان کو ممکنہ حد تک روکھا پھیکا اور غیر اختلافی بنانے کی کوشش کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر میں اس سے زیادہ قطعی کوئی بات کہتا تو وہ اختلاف کا موضوع بن جاتی۔ بالغ انسانی کردار کی تشکیل میں وراثت اور ماحول کے کردار کے تناسب سے متعلق ماہرین نے بے حد مختلف اندازے پیش کئے ہیں۔ ارباب سائنس میں سے جینیٹکس (genetics) کے ماہرین وراثت پر زیادہ زور دینے کا فطری رجحان رکھتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ ماحول کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ اختلاف کی ایک راہ اور بھی ہے اور وہ سائنسی نہیں بلکہ سیاسی ہے۔ قدامت پسند اور سامراجی اس لیے وراثت پر زور دیتے ہیں کہ ان کا تعلق تو سفید فام نسل سے ہے، اگرچہ وہ قدرے غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ انتہاء پسندوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اس لیے تعلیم پر اصرار کرتے ہیں کہ اس میں جمہوریت کے بیج موجود ہیں اور وہ رنگ کے فرق کو نظر انداز کرنے کی ایک دلیل مہیا کرتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ سیاسی اختلاف جینیٹکس (genetics) کے ماہرین اور نفسیات دانوں کے اختلاف پر حاوی ہے۔ ہوگبن اگرچہ ماہر جینیٹکس ہے لیکن اس کے پاس عمدہ نسل پیدا کرنے کے موضوع پر کہنے کو زیادہ باتیں نہیں ہیں۔ دوسری طرف گوڈارڈ اور ٹرمین جیسے سرکاری ماہرین نفسیاتی وراثت پر اصرار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے امریکی ناروی نسل کی برتری کے ہمیشہ سے ہی قائل ہیں۔

چنانچہ آپ نے دیکھا کہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں اختلاف کی گنجائش بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا آیئے ہم پہلے چند یقینی باتیں طے کرلیں۔ تعلیم کے انتہائی پرجوش حامی بھی

http://muftbooks.blogspot.com/

اس امر سے انکار نہیں کرتے کہ انسانوں کے بچے بھی انسان ہی ہوتے ہیں اور جانوروں کی نسبت وہ زیادہ قابل تعلیم بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ ان واضح حقائق پر بھی شبہ نہیں کرتے کہ سفید فام لوگوں کے بچے سفید فام اور سیاہ فام والدین کے بچے سیاہ فام ہوا کرتے ہیں۔ اس کے برعکس وراثت پر زور دینے والے اس سے انکار نہیں کرتے کہ موزوں ماحول کی عدم موجودگی میں ہونہار بچہ بھی خراب ہوسکتا ہے، یا یہ کہ اگر کسی بچے کو شروع ہی سے افیون کھلانی شروع کر دی جائے، جیسا کہ بعض جاہل مائیں کرتی ہیں، تو اس سے بچے کی ذہانت کو ضعف پہنچتا ہے۔ یہ نقاط اگرچہ متفقہ ہیں، تاہم وہ ہمیں زیادہ دور تک نہیں لے جاسکتے۔

اس مسئلے کو سائنسی طریقے سے حل کرتے ہوئے ہمیں اس دشواری سے پالا پڑتا ہے کہ جہاں والدین بچے کو وراثت کے عناصر منتقل کرتے ہیں وہیں وہ بچے کے ماحول کا بہت اہم حصہ بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ بچے اور والدین کے طرزِ عمل میں جو مشابہتیں پائی جاتی ہیں وہ جس طرح وراثت کا نتیجہ ہوسکتی ہیں، اسی طرح والدین کی نقل کا ثمر بھی ہوسکتی ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو یتیم خانوں میں پرورش پانے والے بچے اچھا مواد مہیا کر سکتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہاں وقت یہ ہے کہ ایسے بچوں کے والدین کے بارے میں دستیاب معلومات بہت ناکافی ہوتی ہیں۔ جبلی عناصر کی قوت کا اندازہ کرنے کے لیے جڑواں بچوں کے مطالعے کئے گئے ہیں، لیکن اس معاملے میں بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ان کے ماحول میں قریبی مشابہت پائی جاتی ہے۔ امید کرنی چاہیے کہ کبھی کوئی سائنس کا لکھ پتی دوست پیدائش کے وقت ہی جڑواں بچوں کو الگ تھلگ کرنے کے لیے ٹرسٹ قائم کرے گا۔ یوں ان بچوں میں مختلف حالات میں نشوونما پانے کا موقع ملے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر ملکہ انگلستان جڑواں بچوں کو جنم دے جن میں سے ایک کی پرورش شاہی محل میں اور دوسرے کی کسی کچی آبادی میں ہو تو بیس برس کی عمر میں ان دونوں بچوں میں قریبی ذہنی مشابہت پائی جائے گی۔ تاہم اس ضمن میں تجربہ نہ ہونے کے سبب مجھے اقرار کر لینا چاہیے کہ میری رائے سائنسی نہیں ہے۔ پہلے وقتوں میں یہ یقین کیا جاتا تھا کہ بادشاہوں کا اپنا کردار اور رویئے ہوتے ہیں اور یہ کہ ان کی بنیاد شاہی خون پر ہوتی ہے۔ یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے یہ داستان بیان کی ہے کہ شہزادہ سائرس پیدائش سے لے کر بارہ برس کی عمر تک ایک کسان کے طور پر پلتا بڑھتا رہا۔ پھر بھی اس کے دادا نے اس کے شاہانہ انداز

http://muftbooks.blogspot.com/

دیکھ کر شہزادے کو پہچان لیا تھا لیکن مجھے تو شبہ ہے کہ نارڈک نسل کی برتری میں پر جوش ایمان رکھنے والے لوگ بھی اس کہانی کو درست سمجھیں گے۔

وراثت کی قوتوں کی طرح تعلیم کی قوتوں کو بھی بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ بطاہر معروف ماہر نفسیات ڈاکٹر جان بی۔ واٹسن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مناسب تعلیم کے ذریعے کسی بچے کو بھی موتزارٹ یا نیوٹن بنایا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ بدقسمتی سے اس نے ابھی ہمیں یہ نہیں بتایا کہ یہ تعلیم کس قسم کی ہوگی۔ ویسے واٹسن پہلا شخص نہیں ہے جس نے تعلیم کی قدرت کاملہ میں یقین ظاہر کیا ہو۔ مثال کے طور پر ہم یہاں کتاب ''سیاسی انصاف'' کے مصنف اور مشہور انگریزی شاعر شیلے کے خسر گوڈون کا ذکر کر سکتے ہیں۔ اس موضوع پر اس کے بیانات بالکل واضح ہیں۔ چنانچہ گورڈن کا کہنا یہ ہے کہ ''اس امر کا ثابت ہونا غیر اغلب نہیں ہے کہ ایک عقل مند آدمی کی کھوپڑی بے وقوف شخص کی کھوپڑی سے بڑی ہوتی ہے اور یہ کہ وہ بڑی اس لیے ہوتی ہے کہ عقل مند شخص اپنے دماغ کی قوتوں سے مسلسل کام لیتا رہتا ہے۔'' گورڈن کی یہ باتیں ہمیں ڈاکٹر واٹسن کے نظریات کی یاد دلاتی ہیں۔

تعلیم کی قدرت کاملہ سے متعلق اس نظریئے کے خلاف بہت سے دلائل موجود ہیں۔ عہد حاضر کا کوئی ماہر بھی گوڈون کے اس تصور کو قبول نہیں کرے گا کہ سوچ بچار کی عادت سے انسان کی کھوپڑی کا حجم بڑھ جاتا ہے۔ ویسے یہ امر فیصلہ کن نہیں کیونکہ انتہائی صورتوں سے قطع نظر ذہانت اور دماغ کے حجم میں کوئی تعلق ابھی تک قائم نہیں کیا گیا ہے۔ بے وقوفی اور کم عقلی کا تعلق عام طور پر کھوپڑی کی پیدائش غلط ساخت سے جوڑا جاتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ خود ڈاکٹر واٹسن بھی بے وقوفی کو ناقص تعلیم کا نتیجہ قرار نہ دے گا۔ کم درجے کے بے عقل لوگوں کا معاملہ اس سے محض ایک درجہ کم واضح ہے۔ دوسری طرف کی انتہاء کے لیے حساب کتاب کرنے والے لڑکوں کی مثال لیجئے۔ یہاں میں ان لڑکوں کا ذکر کر رہا ہوں جنہوں نے ریاضی میں غیر معمولی ذہابت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے ماحول میں ایسی کسی شے کی نشاندہی محال ہے جس کو اس غیر معمولی اہلیت کا سبب قرار دیا جا سکے۔ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ احمق اور اس قسم کی غیر معمولی ذہانت کے حامل لڑکے پیدائشی طور پر ہی اوسط درجے کے لڑکوں سے مختلف ہوتے ہیں تو پھر یہ شبہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان سے کم تر درجے کی ایسی مثالیں موجود نہیں ہیں جو پیدائشی طور پر مختلف ہوں۔

غیر سائنسی اثرات پر اعتماد کرنا اگرچہ خطرناک ہوتا ہے، تاہم میرے خیال میں

http://muftbooks.blogspot.com/

تدریس کے شعبے سے عملی تعلق رکھنے والے اساتذہ کے تجربے کو کچھ وزن تو ضرور دنیا چاہیے۔ جہاں تک میں دریافت کر سکا ہوں، ان میں سے کسی استاد نے بھی اس پر شبہ نہیں کیا کہ طالب علموں میں پیدائشی قابلیت مختلف قسم کی ہوا کرتی ہے۔ یہ بات اگر محال نہیں تو بے شک مشکل ضرور ہے کہ اس میں سے کون سی چیز وراثت کے سبب ہے اور کون سے ماحول کا عطیہ ہے۔ البتہ میرے خیال میں یہ بات کم وبیش طے شدہ ہے کہ دو بالغ افراد کی ذہانت میں پائے جانے والے فرق کا کچھ حصہ پیدائشی ہوتا ہے۔

خیر، معاملہ یہ ہے کہ گورڈن اور ڈاکٹر جاب بی۔ واٹسن دونوں نے ایک ایسی دلیل دی ہے جس کے حوالے سے وہ اپنا دعویٰ ثابت کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ انسانوں میں کوئی جبلت نہیں ہوتی۔ لہٰذا بچے کے ذہن میں تجربے سے ماورا کوئی خصوصیت بھی نہیں ہوتی۔ ہم اس دلیل کا توڑ معروف روسی ماہر نفسیات پاف لوف کے حوالے سے کر سکتے ہیں۔ پاف لوف کا دعویٰ یہ تھا کہ اس کے کتوں میں وہ چاروں مزاج پائے جاتے ہیں جن کا ذکر بقراط نے کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ کتے ان مزاجوں سے مخصوص کی جانے والی مختلف اعصابی امراض کا شکار بھی رہتے ہیں۔ شاید اس بات کا جواب ڈاکٹر واٹسن یہ دے گا کہ مزاج کا فرق ان حالات کا نتیجہ ہوسکتا ہے جن سے پاف لوف آگاہ نہ تھا اور یہ کہ تمام کتے مساوی پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں لازماً اس کی نظری دلیل کا سامنا کرنا چاہیے۔

چلئے دلیل کی خاطر ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ تمام نومولود بچوں میں انکنڈیشنڈ ریفلیکسیز unconditioned reflexes (جنہوں نے جبلتوں کی جگہ لے لی ہے) ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اچھا، تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بچوں میں کسی قسم کے پیدائشی ذہنی امتیازات نہیں ہو سکتے؟ کنڈیشنڈ ریفلیکسز (conditioned reflexes) کی آموزش کو ہی لیجئے۔ بعض بچے ان کو دوسروں کی نسبت جلد سیکھ لیتے ہیں۔ جب کہ بعض دوسرے بچے معمولی فرق رکھنے والے محرکات کو زیادہ موثر انداز میں سیکھ سکتے ہیں۔ اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ تعلیم کا سارا دارومدار کنڈیشنڈ ریفلیکسز کی تشکیل پر ہے، جو کہ ایک اختلافی مفروضہ ہے، تب بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام بچوں میں تعلیم حاصل کرنے کی یکساں صلاحیت ہوتی ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ نظریئے میں یا عملی مشاہدے کے حوالے سے وراثت کے مقابلے میں تعلیم کے انتہاء پسند حامیوں کا موقف کسی طور پر بھی بہتر نہیں ہے۔

بہرحال، اگرچہ انسانوں کے مابین پیدائشی امتیازات کی اہمت سے انکار نہیں

http://muftbooks.blogspot.com/

کیا جا سکتا، تاہم نسلی اصطلاح کے ماہرین کے اخذ کردہ نتائج بھی زیادہ تر غیر سائنسی ہی ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ سماجی طور پر پسندیدہ اوصاف کی تشکیل کرنے والے کون سے عوامل وراثتی ہیں یا یہ کہ کون کون سے عوامل موثر اور زوال آمادہ ہیں۔ اتفاق تو دراصل اس بات پر بھی نہیں ہے کہ سماجی لحاظ سے پسندیدہ شے کیا ہے۔ بہت ہی محدود مشاہدے کی بنیاد پر میں یہ سمجھنے پر مائل ہوں کہ مصوری میں مہارت اور حساب کتاب میں نااہلی کے درمیان کوئی نہ کوئی تعلق ہے۔ اچھا اگر واقعی ایسا ہو تو پھر نسلی اصلاح کے ماہرین کو اس بارے میں کیا کرنا چاہیے؟ کیا مصوروں کی ایک ایسی نسل پیدا کریں جو حساب کتاب سے بالکل بے بہرہ یا ایسے حساب دانوں کی نسل تخلیق کریں جو فن سے بے نیاز ہو؟

ذہانت کے معروف ٹیسٹ اپنی اپنی حدود میں قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ البتہ اخلاقی یا فنی اوصاف کا جائزہ لینے کے ضمن میں وہ کوئی مدد نہیں دیتے۔ اصلاح نسل کے کسی قسم کے عملی اقدامات کی اخلاقی یا سائنسی بنیادیں مناسب حد تک ٹھوس نہیں ہیں۔ بس یہ ہے کہ ان کی مدد سے ضعیف العقل لوگوں کو بانجھ بنایا جا سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل مفروضے غیر مستند ہیں:

☆ یہ کہ یورپ یا امریکہ میں پیدا ہونے والوں کے مقابلے میں ایشیائی لوگ کم رتبہ ہوتے ہیں۔

☆ یہ کہ 45 درجہ عرض بلد کے شمال میں پیدا ہونے والے یورپی پیدائشی طور پر اس عرض بلد کے جنوب میں پیدا ہونے وال یورپیوں سے بہتر ہوتے ہیں۔

☆ یہ کہ جن کے والدین کی سالانہ آمدنی ایک ہزار پونڈ سے زیادہ ہوتی ہے وہ غریب والدین کی اولاد سے بہتر رتبے کے مالک ہوتے ہیں۔

یہ ساری باتیں غلط سہی، لیکن اصلاح نسل کے اکثر ماہرین ان میں یقین رکھتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اوپر بیان کئے گئے مفروضوں میں سے پہلے تین تارکان وطن سے متعلق امریکی قوانین پر اثر انداز بھی ہوئے ہیں۔

قابلیت کی وراثت کے مسئلے سے سائنسی طور پر عہدہ برآ ہونے کے لیے بہت سا ابتدائی کام درکار ہوگا۔ سب سے پہلے تو ایسی قابل پیمائش ذہنی صفات کو دریافت کرنے کی ضرورت ہوگی جن کا انحصار تعلیم پر نہ ہو۔ ذہنی پیمائش کے ٹیسٹ اسی مقصد کے لیے تیار کئے جاتے ہیں، لیکن وہ زیادہ سے زیادہ کسی یکساں سماجی ماحول میں ہی یہ کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر روپے پیسے کے سوالات لیجئے۔ دیہاتی بچوں کے مقابلے میں

http://muftbooks.blogspot.com/

شہری بچے زیادہ تیزی سے ان کا جواب دیتے ہیں۔

ہوتا یہ ہے کہ جونہی ذہنی آزمائش کے امتحانات کا اطلاق زیادہ مختلف پس منظر کے حامل بچوں کے درمیان موازنے کے لیے کیا جائے تو وہ فوراً گمراہ کن ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ماحول کے مقابلے میں وراثت میں اعتقاد رکھنے والے اکثر صاحبان اپنے نتائج ایسے ہی اطلاعات سے حاصل کرتے ہیں۔

بچے جب تک والدین کے ساتھ رہیں، کسی ذہنی مماثلت کے معاملے میں وراثت اور تعلیمی عوامل کو الگ تھلگ کرنا محال ہوتا ہے۔ اگر پوری کی پوری آبادی پر ہی ذہنی آزمائش کے امتحان آزمائے جائیں تو پھر کچھ عرصے بعد یتیم خانوں سے اہم مواد حاصل کیا جا سکے گا۔ تب اگر یہ پتہ چلے کہ کسی یتیم خانے کے بچوں اور ان کے والدین کی ذہانت میں کوئی اضافت موجود ہے، تو پھر وہ وراثت کے حق میں ایک اچھی شہادت ہوگی۔ تاہم فی الحال ایسی کسی شہادت کو حاصل کرنا باقی ہے۔

ذہنی وراثت کے قوانین کی جستجو میں منتخبہ صفت کو سادہ، معین اور قابل پیمائش ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر کوئی جملہ، بہتر تو یہ ہے کہ کوئی بے معنی جملہ، بولا جائے اور بچے سے اسے دہرانے کو کہا جائے۔ کوئی بچہ کسی لمبے سے لمبے جملے میں سے جس قدر الفاظ درست طور پر دہرا سکے گا، اس سے اس کی ذہنی صلاحیت کا پتہ چلے گا۔ تاہم ضروری نہیں کہ وہ پسندیدہ بھی ہو۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں میکالے میں یہ خوبی نا قابل یقین حد تک موجود تھی۔ تاہم بدقسمتی سے اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ آیا اس کے باپ یا ماں میں بھی یہ خوبی تھی یا نہیں۔ اگر سکول میں پڑھنے کے تمام عرصہ کے دوران ہر سالگرہ کے موقع پر تمام بچوں کا اس ضمن میں امتحان لیا جاتا رہے تو پھر شاید چالیس برسوں میں ہم ذہنی وراثت کے بارے میں اچھا مواد حاصل کر سکیں گے۔

بہرطور پر اس قسم کے شماریاتی طریقے مینڈل کے نقش قدم پر چلنے والوں کو مطمئن نہ کر سکیں گے۔ کیونکہ ان کی خواہش تو یہ ہے کہ وراثت کی کسی مثال میں کسی مخصوص نسل یا نسلوں کے گروہ کو الگ تھلگ رکھا جائے۔ ذہنی صفات اس قدر پیچیدہ ہوتی ہیں کہ آنے والے طویل عرصے تک اس کام کے مکمل ہونے کی کوئی امید نہیں۔ ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ بعض ذہنی صفات دوسری صفات کے مقابلے میں زیادہ قابل علیحدگی ہوں۔ ریاضی اور

http://muftbooks.blogspot.com/

موسیقی دونوں کی استعداد خود کو اس معاملے میں موزوں مثال کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ اعداد وشمار کے اعتبار سے یہ دونوں کامیاب ہیں۔ لیکن جہاں کہیں وہ موجود ہوں تو عموماً اوسط درجے سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہوتی ہیں۔ دونوں خاندانی سلسلے کے طور پر چلنے کا رجحان رکھتی ہیں۔ البتہ یہ جاننا مشکل ہے کہ اس میں تعلیم کا کس قدر ہاتھ ہوتا ہے۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ مشہور موسیقار موتزارٹ کا باپ بھی موسیقی سے شغف رکھتا تھا۔ لیکن اس نے موسیقی کی تربیت کے ساتھ ساتھ موسیقی کی اہلیت کو بھی بیٹے کی طرف منتقل کیا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، کوئی بڑا موسیقار یا ریاضی دان یتیم خانے سے نہیں اٹھ سکا۔ لہٰذا وراثت کو جانچنے کا یہ طریقہ ہمارے کام نہیں آ سکتا۔

گالٹن اور اس کے پیروؤں نے قابلیت کو موروثی ثابت کرنے کے لیے جو کام کیا ہے وہ سائنسی لحاظ سے یقین دلانے والا نہیں ہے۔ البتہ ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ان کے دعوے میں کسی قدر سچائی موجود ہے۔ لیکن جب تک گھریلو ماحول کے اثرات کو علیحدہ کرنے کے لیے طریقے دریافت نہیں ہوتے، یہ سارا موضوع لازماً شک وشبہات کا شکار رہے گا۔

عملی معلم کے نقطۂ نظر سے اس بحث کا حاصل واضح ہے۔ طالب علموں کی قابلیت میں امتیازات متوقع ہیں اور ہم ان امتیازات کو ماحول کا نتیجہ قرار نہیں دے سکتے۔ بہرطور جس قدر بھی فطری اہلیت دریافت ہو، اسے پروان چڑھانا چاہیے اور اگر وہ واقعی غیر معمولی ہو تو پھر ابتدائے عمر ہی سے اس پر وہ تمام وقت صرف ہونا چاہیے جو بصورت دیگر عمومی تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے۔ تاہم کسی طالب علم یا طالب علموں کی کسی جماعت کی ذہانت کے حق میں یا اس کی مخالفت میں حسب ونسب، سماجی حیثیت یا والدین کے ذاتی کارناموں کے حوالے سے کوئی رائے ہرگز قائم نہیں کرنی چاہیے۔ قابلیت کے موروثی ہونے کے بارے میں تحقیق وتفتیش کی گنجائش موجود ہے اور ایسے طریقوں کی دریافت دشوار نہیں جن کی مدد سے اس مسئلے کا سائنسی طور پر مطالعہ ممکن ہو سکے۔ لیکن بات یہ ہے کہ اگر اس قسم کے طریقوں کو اختیار کیا گیا تو بھی ان کے بارآور ہونے کے لیے کم از کم ایک نسل تک انتظار کرنا پڑے گا۔ اس عرصے کے دوران سائنسی طور پر موزوں موقف یہی ہے کہ ہم فطری قابلیت کی تقسیم اور اس کی وراثت کے قوانین کے بارے میں اپنی لاعلمی کا اعتراف کریں۔

❁❁❁

http://muftbooks.blogspot.com/

چوتھا باب

جذبہ اور نظم وضبط

ہر دور میں تعلیم کے دو مقاصد رہے ہیں یعنی تدریس اور اچھے طور طریقوں کی تربیت۔ اب جہاں تک اچھے کردار کا تعلق ہے، اس کا تصور جماعت یا گروہ کے سیاسی اداروں اور سماجی روایات کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ قرون وسطیٰ میں جب غلام سے لے کر خدا تک مرحلہ وار نظام مدارج رائج تھا تو اطاعت شعاری کو سب سے بڑی خوبی سمجھا جاتا تھا۔ بچوں کو تربیت یہ دی جاتی تھی کہ وہ والدین کی اطاعت کریں اور سماجی بزرگوں کا احترام کریں۔ انہیں مذہبی رہنما کی موجودگی پر خود پر ہیبت طاری کرنے اور جاگیردار کی خدمت میں عجز وانکسار سے کام لینے کا درس دیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں صرف بادشاہ اور پوپ ہی آزاد تھے۔ اس زمانے کے اخلاقی نظام میں آزاد لوگوں کے لیے کوئی رہنمائی موجود نہ تھی، اس لیے وہ اپنا وقت ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے جھگڑنے میں بسر کرتے تھے۔ نصب العین اور طریقہ کار دونوں حوالوں سے آج کے عہد کے لوگ تیرھویں صدی کے لوگوں سے مختلف ہیں۔ جمہوریت نے اطاعت کی جگہ تعاون کو اور تعظیم وتکریم کی جگہ گروہی جبلت کو عطا کر دی ہے۔ یہ گروہی جبلت جس گروہ کے لیے سب سے زیادہ سرگرم کار ہوتی ہے، وہ قوم کا روپ دھار چکا ہے۔ پہلے زمانوں میں مذہب کی عالمگیری کی بنا پر قوم پر امت کے تصور کو ترجیح حاصل تھی۔ علاوہ ازیں اب پراپیگنڈہ کی نوعیت جبری نہیں رہی، ترغیبی بن گئی ہے۔ اس نے بچوں میں مناسب جذبات پیدا کرنے کے ذریعے آگے بڑھنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔ مذہبی گیت، مدرسوں کے نغمے اور قومی جھنڈے بچوں کے ذہن پر اس قدر اثر انداز ہوتے ہیں کہ ان کی پوری زندگی اس اثر کے ماتحت رہتی ہے۔ ان تمام اثرات کے مقابلے میں عقل کی تگ ودو کم وبیش بے نتیجہ ہی رہتی ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

ابتدائی تعلیم پر سیاسی تصورات کا اثر عام طور پر غیر واضح رہتا ہے اور مدارس سے غیر شعوری طور پر ہی سرزد ہوتا ہے۔ لہٰذا اس وقت میں سیاسی نظام سے حتی الامکان قطع نظر کرتے ہوئے کردار کی تربیت پر توجہ دینا چاہتا ہوں۔ بعد ازاں میں سماجی نظام کے موضوع پر بحث کروں گا۔

جب کسی بچے یا جانور کے کردار میں کوئی خاص انداز پیدا کرنا ہو تو پھر اس کے لئے دو مختلف طریقے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم انعام یا سزا کے ذریعے کسی بچے یا جانور کو کوئی خاص کام کرنے یا اس سے روکنے پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بچے یا جانور میں ایسے جذبات پیدا کئے جائیں جو اس کو مجموعی طور پر مطلوبہ افعال کی طرف لے جائیں۔

جزا و سزا کی مناسب تقسیم کے ذریعے ظاہری کردار کے بہت بڑے حصے کو کنٹرول کرنا ممکن ہے۔

عام طور پر جس قسم کے انعام یا سزا کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ تعریف کی جائے یا لعن طعن کی جائے۔ اس طریقے کو استعمال میں لاتے ہوئے ایسے لڑکوں میں جسمانی جرات پیدا کی جا سکتی ہے جو فطری طور پر بزدل ہوتے ہیں۔ اسی طرح زود رنج بچوں میں برداشت کا مادہ پیدا کیا جا سکتا ہے، اچھے طور طریقے اگر بچپن میں نہ سکھائے گئے ہوں تو عنفوان شباب کے زمانے میں انہیں سکھانے کے لئے آنکھوں کی حقارت آمیز حرکت ہی کافی ہو سکتی ہے۔ جن باتوں کو ہم اچھے طور طریقوں سے تعبیر کرتے ہیں، ان کو کم وبیش وہ تمام لوگ سیکھ سکتے ہیں جن کو ان سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان طور طریقوں کو نظر انداز کرنے سے دوسروں کی نظر میں گنوار قرار پانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ جن لوگوں کو بالکل بچپن ہی سے اپنے گروہ کی ناپسندیدگی سے ڈرنے کی تربیت دی جاتی ہے، وہ احمقوں کے طنز کا نشانہ بننے پر ایسی جنگ میں مرنے کو ترجیح دیتے ہیں جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے۔ برطانیہ کے پبلک سکولوں نے اس نظام کو تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔ انہوں نے ذہانت کو گروہ کا غلام بنا کر اسے بڑی حد تک کچل دیا ہے۔ یہ ہے وہ چیز جسے لڑکے کو مردانہ صفات عطا کرنے کا نام دیا جاتا ہے۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ سماجی قوت کی حیثیت سے کردار کا تشکیلی طریقہ بہت طاقتور

http://muftbooks.blogspot.com/

اور بہت کامیاب ہے۔ وہ لوگوں کو اپنا چال چلن بدلنے پر مجبور کرسکتا ہے اور کرتا بھی ہے۔ مزید برآں وہ ظاہری کردار میں متاثر کن ہم آہنگی پیدا کرنے کے قابل ہے۔ پھر بھی اس کی اپنی حدود ہیں۔

یہ فرائڈ تھا جس نے پہلے پہل ایک سائنسی انداز میں اس کی حدود کرا جاگر کیا۔ اس سے پہلے نفسیاتی بصیرت کے حامل لوگ وجدانی انداز میں ان حدود کا ادراک رکھتے تھے۔ ہمارے مقاصد کے حوالے سے تحلیل نفسی کی بنیادی دریافت یہ ہے کہ جس تحریک کو عمل میں ظاہری اظہار پانے سے کرداری طریقوں کے ذریعے روک دیا جاتا ہے، وہ ضروری نہیں کہ ختم ہو جائے۔ اس کے بجائے ہوتا یہ ہے کہ وہ دب جاتی ہے اور اظہار کی ایسی راہ تلاش کرتی ہے، جس کو تربیت کے ذریعے بند نہیں کیا گیا ہوتا۔ اکثر اوقات اظہار کی یہ نئی راہ اس سے زیادہ نقصان دہ ہوتی ہے۔ جس پر پابندی عائد کی جاتی ہے۔ یہ نہ بھی ہو تو تحریک کے اظہار کی راہ میں رکاوٹ سے جذباتی خلل پیدا ہوتا ہے اور توانائی بھی بے فائدہ طور پر خرچ ہوتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ظاہری کردار کے مقابلے میں جذبے پر زیادہ توجہ دی جائے۔ جتنی کہ کردار کی تربیت کے لئے تشکیلی طریقہ کار کو کافی خیال کرنے والے دیتے ہیں۔

بات یہ بھی ہے کہ بعض ناپسندیدہ عادات کے معاملے میں جزا و سزا کا طریقہ کار خود اپنے نقطۂ نظر سے بھی ناکام ثابت ہوا ہے۔ ان میں سے ایک بستر پر پیشاب کرنا ہے۔ جب یہ عادت اس وقت بھی جاری رہے جب کہ اسے عام طور پر ختم ہو جانا چاہئے تو پھر بچے کو سزا دینے سے یہ عادت مزید بگڑ جاتی ہے۔ اچھا اب یہ ایسی بات ہے جو ایک عرصے سے نفسیات دانوں کو معلوم ہے، لیکن اکثر سکول ماسٹر اس سے بے خبر ہیں اور وہ برس ہا برس سے اس عادت کے لئے بچوں کو پیٹتے چلے آ رہے ہیں۔ انہیں کبھی احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس مار پیٹ سے کوئی اصلاح نہیں ہوتی۔ بڑی عمر کے لڑکوں میں اس عادت کی وجہ عام طور پر گہرا نفسیاتی خلل ہوتا ہے۔ چنانچہ موثر علاج کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے اس خلل کو واضح طور پر لایا جائے۔

بہت سی کم واضح مثالوں میں اسی قسم کی نفسیاتی میکانیت کارفرما ہوتی ہے۔ یقینی نفسیاتی بیماریوں میں اس حقیقت کو اب عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بچوں

http://muftbooks.blogspot.com/

میں چوری کا جنون کئی غیر معمولی بات نہیں۔ عام چوری کی طرح اس جنون کا علاج سزا کے ذریعے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے تو ضروری ہوتا ہے کہ اس کے نفسیاتی سبب کو سمجھا جائے اور اسے دور کیا جائے۔ جس بات کا احساس کم کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم سب تھوڑی بہت حد تک جذباتی نوعیت کے حامل اعصابی امراض کا شکار ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص اپنے گردوپیش کے لوگوں کی طرح ذی ہوش ہو تو ہم اسے ہوش مند اور سیانا قرار دیتے ہیں۔ لیکن ایسے کسی اوسط قسم کے ہوش مند فرد میں بھی خیالات اور افعال کی تشکیل کرنے والے ایسے کئی فکری عمل ہوتے ہیں، جو بالکل عجیب وغریب ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ حقیقی ہوش مندی کی دنیا میں انہیں غیر معقول ہی سمجھا جائے گا۔

بات یہ ہے کہ ایسے طریقوں سے اچھا سماجی رویہ پیدا کرنا خطرناک ہے جو سماج دشمن جذبوں کو جوں کا توں رہنے دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں سماج دشمن جذبے اندر ہی اندر مضبوط تر ہوتے چلے جاتے ہیں اور ایسی تحریکوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو بالآخر ناقابلِ مدافعت ہو جاتی ہیں۔ کمزور قوت ارادی کے حامل شخص میں یہ تحریکیں جرم یا سماجی طور پر کسی اور ناپسندیدہ صورت میں اظہار کی راہ تلاش کر لیتی ہیں۔ جب کہ مضبوط ارادے والے افراد میں ان کا اظہار اور بھی زیادہ ناپسندیدہ صورتوں میں ہوسکتا ہے۔ اس قسم کا شخص گھر میں جابر، کاروبار میں بے رحم، سیاست میں جھگڑالو اور سماجی کردار میں سنگ دل بن سکتا ہے۔ کردار کی اس قسم کی خامیاں رکھنے والے دوسرے لوگ ان باتوں کے لئے اس کی تعریف وتوصیف کرنے لگتے ہیں۔ جب ایسا شخص کسی شہر یا قوم یا زمانے میں اپنی اہلیت اور مواقع کے مطابق نفرت اور مصیبت پھیلا کر اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو دنیا بھر میں اس کا احترام کیا جاتا ہے۔ انسانی خوشیوں میں اضافہ کرنے کے لیے ایک آدمی میں صحیح کردار اور ناپسندیدہ جذبوں کا ملا جلا ہونا کافی نہیں اگر پسندیدہ کردار کے بارے میں ہمارا معیار یہی ہے تو پھر کردار کی تعلیم میں لازماً کسی اور شے کی جستجو کرنا ہوگی۔

یہ اور نیز بچوں کے ہمدردانہ مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ کردار سازی کا کرداری دانش وروں کا وضع کردہ طریقہ ناکامی ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ کسی مختلف طریقے سے اسے مکمل بنایا جائے۔

بچوں کے تجربے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر بچوں کو ایسا ماحول مہیا کر دیا جائے

http://muftbooks.blogspot.com/

جس میں پسندیدہ جذبے تو عام ہوں اور ناپسندیدہ جذبے بہت ہی کم ہوں تو پھر نہ صرف ان کے ظاہری کردار بلکہ ان کے احساسات پر بھی اثر انداز ہوا جا سکتا ہے۔ بعض بچے (اور بعض بالغ افراد بھی) خوش باش طبیعت کے مالک ہوتے ہیں۔ دوسرے افسردہ رہتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ جو خوشی بھی ملے اس سے مطمئن ہو جاتے ہیں، جب کہ ایسے بھی ہیں کہ جو من کی مراد حاصل کئے بغیر سکھ نہیں پاتے۔ بعض ایسے ہیں کہ جب تک انہیں کوئی ثبوت نہ ملے وہ اکثر لوگوں پر دوستانہ اعتماد کرتے ہیں جب کہ بعض اکثر لوگوں کو شدید شک وشبے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ بچے کا جذباتی رویہ عام طور پر وہی ہوتا ہے جو کہ بالغ کا ہوتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بالغ زندگی میں انسان اپنی کمزوریوں اور رنجشوں کو کسی نہ کسی حد تک چھپانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ بات بہت ضروری ہے کہ بچوں کے جذباتی رویے ایسے ہوں کہ جو انہیں نہ صرف بچپن میں بلکہ بعد کی زندگی میں بھی رنج، ناکامی اور بد اندیشی کے بجائے خوشی، کامیابی اور بامرادی کی منزل کی طرف لے جائیں۔ اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ نفسیات اس قسم کے ماحول کا تعین کر سکتی ہے جو پسندیدہ جذبوں کو فروغ دینے والا ہو۔ یہ بھی درست ہے کہ اکثر اوقات سائنس کی مدد کے بغیر ہی ذہانت آمیز شفقت بھی صحیح نتیجے کی طرف رہنمائی کر سکتی ہے۔ جب اس طریقے کو درست طور پر استعمال کیا جائے تو کردار پر اس کا اثر اس سے زیادہ نمایاں اور زیادہ تسلی بخش ہوتا ہے جتنا کہ انعام اور سزا کے طریقے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

بچے کے لئے صحیح جذباتی ماحول ایک نازک سا مسئلہ ہے اور وہ بچے کی عمر کے ساتھ بدلتا بھی رہتا ہے۔ بالپن کے سارے زمانے میں احساس تحفظ درکار ہوتا ہے، جس میں بتدریج کمی بھی ہوتی جاتی ہے۔ اس مقصد کی خاطر محبت وشفقت اور خوش گوار دستور و ضابطہ لازمی ہیں۔ بڑوں کے ساتھ تعلق جذباتی محبت کے بجائے کھیل کود اور جسمانی آسائش کی نوعیت کا ہونا چاہئے۔ دوسرے بچوں کے ساتھ گہری بے تکلفی ہونی چاہئے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تعمیر وجستجو اور ذہنی وفنی سمتوں میں پیش قدمی کا موقع حاصل ہونا چاہئے۔ بچے کو تحفظ اور آزادی کی دو متضاد ضرورتیں ہوتی ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ تحفظ کی ضرورت کم ہوتی جاتی ہے جب کہ آزادی کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے۔ بچے کو بالغوں کو محدود نہ کرے اور نہ ہی بچے میں گہرا جذباتی ردِعمل پیدا کرے۔ کھیل کود بچپن

http://muftbooks.blogspot.com/

کی اہم ضرورت ہے۔ اس میں نہ صرف دوسرے بچوں کو بلکہ والدین کو بھی شامل ہونا چاہئے۔ یہ بچوں اور والدین میں بہترین تعلق استوار کرنے کے لئے بے حد ضروری ہے۔

موجودہ حالات میں آزادی کا عنصر سب سے زیادہ مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک گزشتہ باب میں دلائل پیش کئے گئے ہیں، میں مطلق آزادی کا حامی نہیں ہوں۔ تاہم میں آزادی کی بعض ایسی صورتوں کا علمبردار ضرور ہوں جن کو اکثر بالغ لوگ ناقابلِ برداشت خیال کرتے ہیں۔ مثلاً میرے نزدیک بچوں کو بزرگوں کا احترام کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہئے۔ اگر کبھی بچے انہیں احمق کے نام سے پکارنا چاہیں تو انہیں اس بات کی آزادی ہونی چاہئے۔ ظاہر ہے کہ محض جبر کے ذریعے ہم بچوں کو اس بات سے منع نہیں کر سکتے کہ وہ ہمیں احمق خیال کریں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر وہ ہمیں احمق کہنے کی جرآت نہ کر سکیں تو دل ہی دل میں اور بھی برا بھلا کہیں گے۔ اسی طرح بچوں کو قسم کھانے سے نہ روکنا چاہئے۔ وجہ یہ نہیں کہ قسم کھانا کوئی اچھی بات ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ جان جائیں کہ جب وہ سچ بول رہے ہوں تو پھر قسم کھانے یا نہ کھانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ علاوہ ازیں بچوں کے لئے جنس کو شجرِ ممنوعہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس معاملے میں انہیں مکمل آزادی حاصل ہونی چاہئے۔ بڑوں کو انہیں ٹوکنا نہیں چاہئے خواہ ان کی گفتگو ناشائستہ ہی معلوم ہو اگر بچے کسی مذہبی، سیاسی یا اخلاقی موضوع پر رائے دیں تو انہیں دلیل سے جواب دینا چاہئے۔ بڑوں کا فرض یہ ہے کہ وہ بچوں کی رہنمائی کریں۔ یہ نہیں کہ وہ ان پر اپنے فیصلے ٹھونسنے لگیں۔

اس قسم کے حالات میسر آ جائیں تو بچے بے خوفی اور خوش و خرم انداز سے نشو و نما پاتے ہیں۔ ان کی ذہانت زنجیروں سے آزد ہوتی ہے اور انسانی اُمور میں ان کے خیالات اس محبت اور ہمدردی سے لبریز ہوتے ہیں جو اطمینان اور دل جمعی سے حاصل ہوتی ہے۔ اس قسم کے جذبات کے حامل انسانوں کی دنیا ہمارے سماجی نظام کا خاتمہ کر دے گی جس میں جنگیں ہیں، جبر ہے، معاشی ناانصافی ہے، آزادی اظہار اور آزادی تحقیق کا خوف ہے اور جس کا اخلاقی ضابطہ توہم پرستی پر مبنی ہے۔ یہ تمام برائیاں آزادی کے فقدان سے پیدا ہونے والی ذہنی و فکری بزدلی اور بداندیشی کے سبب برداشت کی جاتی رہی ہیں۔ ڈاکٹر واٹسن کردار کے طبعی پہلوؤں کی اہمیت کو کم کرنے کا رجحان رکھتا ہے۔ اس کے باوجود اسے بھی اقرار ہے کہ جب کسی بچے کے کسی عضو کو کھینچا جائے تو ان سیکھے اور طبعی

http://muftbooks.blogspot.com/

ردِعمل کے طور پر وہ غصے کا اظہار کرتا ہے۔ یہی وہ جبلی جذبہ ہے جو آزادی کی چاہت کی اساس ہے۔ جس شخص کی زبانی قانون کے ذریعے بند کر دی جائے، جس کے قلم پر سنسر شپ کی پابندیاں عائد کر دی جائیں، جس کی محبت پر اس اخلاقی ضابطے کا پہرہ بٹھا دیا جائے جس کے نزدیک رقابت محبت سے بہتر کوئی شے ہو، جس کے لڑکپن پر آداب کا بوجھ لاد دیا گیا ہو اور جس کے شباب کو مذہب کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہو، وہ اس رکاوٹوں بھری دنیا کے خلاف ویسا ہی غصہ محسوس کرے گا جیسا غصہ کوئی بچہ اس وقت محسوس کرتا ہے جس کے ہاتھ پاؤں جکڑ دیئے گئے ہوں۔ غصے کے عالم میں وہ تخریب کاری کی طرف مائل ہوگا، وہ انقلابی، انتہاء پسند یا پھر اپنے مزاج اور موقع کے مطابق اذیت پسند معلم اخلاق بن جائے گا۔ بہتر دنیا کی تشکیل کے قابل انسانوں کو تیار کرنا جذباتی نفسیات کا ایک مسئلہ ہے۔ یہ ایسے انسانوں کی تیاری کا مسئلہ ہے جو آزاد ذہانت کے ساتھ ساتھ خوش باش افتاد طبع کے مالک ہوں۔ بلاشبہ یہ مسئلہ سائنس کے دائرہ کار سے باہر نہیں۔ اصل میں کمی قوت کی نہیں ارادے کی ہے۔

❁❁❁

http://muftbooks.blogspot.com/

پانچواں باب

گھر بمقابلہ سکول

اب یہ رائے متروک ہو چکی ہے کہ بچوں کو مکمل طور پر گھر ہی میں تعلیم دی جانی چاہئے۔ لاک اور روسو جیسے بڑے فلسفیوں نے اپنی کتابوں میں اس نقطہ نظر کی تائید کی تھی اور سکندرِ اعظم ہنی بال نیز مشہور برطانوی مفکر جان سٹورٹ کی تعلیم و تربیت گھر ہی میں ہوئی تھی۔ بات یہ ہے کہ اس قسم کی تعلیم صرف امیروں کے لئے ہی ممکن ہے اور محض اسی حوالے سے ہمیں اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ مسئلہ جائز طور پر بحث طلب ہے کہ گھر اور سکول میں کیا رشتہ ہونا چاہئے اور یہ کہ بچوں کو کس عمر میں سکول جانا چاہئے۔

یورپ کے اکثر ملکوں نے اس رائے کو تسلیم کر لیا ہے کہ محنت کشوں کے اکثر بچوں کو چھ سے تیرہ چودہ برس تک کی عمر کے دوران سکول جانا چاہئے۔ اس طبقے کے زیادہ قابل لڑکوں اور لڑکیوں کو وظائف دے کر اس عمر کے بعد بھی تعلیم جاری رکھنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ جہاں تک آسودہ حال والدین کا تعلق ہے، ان کے بیٹے اور بیٹیاں تو خیر زیادہ عرصے تک سکول جاتے ہی ہیں۔ اس بارے میں اتفاق رائے موجود نہیں کہ عمومی تعلیم کو کس عمر کی حد تک جاری رکھنا پسندیدہ ہے۔ اسی طرح یہ معاملہ بھی طے شدہ نہیں کہ بچوں کی تعلیم کے لئے عام سکول بہتر ہیں یا رہائشی سکول۔ لگتا ہے کہ یہ ایک عام رائے بن چکی ہے کہ جس شے کو ہم اچھا گھر کہتے ہیں وہ بورڈنگ سکول سے بہتر ہے۔ ساتھ ہی ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ گھروں کا ایک غیر متعین تناسب ایسا بھی ہے جن کو ہم اچھے گھر نہیں کہہ سکتے۔ میرے خیال میں یہ ایک مشکل مسئلہ ہے کیونکہ اس کے مختلف پہلوؤں پر ٹھوس دلائل موجود ہیں۔ اصل میں اس مسئلے کے دو حصے ہیں۔ اول یہ کہ بچے کو کس عمر میں سکول جانا چاہئے اور دوئم یہ کہ آیا اس سکول کو عام سکول ہونا چاہئے یا رہائشی سکول۔ آیئے ہم باری

http://muftbooks.blogspot.com/

باری ان سوالات پر غور کریں۔

سکول جانے کی عمر کا آغاز کب ہو؟ بچے کو کس عمر میں سکول جانا شروع کرنا چاہئے؟ اس سوال کے جواب کا دارومدار لازمی طور پر گھر پر ہونا چاہئے۔ اس کا مطلب گھر کی جغرافیائی کیفیت نہیں بلکہ اس کی اخلاقی یا نفسیاتی نوعیت ہے۔ مثلاً اگر کوئی بچہ گاؤں میں رہتا ہے تو رسمی تعلیم کے لئے ضروری ہونے والی عمر سے پہلے وہ اپنا وقت خوش باشی سے اور مفید طور پر کھیل کود میں، جانوروں کا مشاہدہ کرنے، بھوسے کی تیاری کو دیکھنے، فصلیں کاٹنے، انہیں صاف کرنے اور ہل جوتنے میں صرف کرسکتا ہے۔ شہری بچے کے لئے معاملہ بالکل مختلف ہے جس کے ماں باپ تنگ و تاریک گھروں میں رہتے ہیں۔ اس کے لئے سکول آزادی کی فضاؤں میں جانے کا نام ہے جہاں اسے حرکت کی، شور مچانے کی اور دوست بنانے کی آزادی میسر آتی ہے۔ بارہا مجھے طبی پیشے سے منسلک ایسے افراد سے میل جول کا موقع ملا ہے جو اس لئے نرسری سکولوں کی مخالفت کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک ہر سکول کو محض ایسی جگہ ہونا چاہئے جہاں مقررہ اسباق پڑھائے جاتے ہیں۔ مناسب قسم کے نرسری سکول میں پڑھانے کا کام صرف اسی قدر ہونا چاہئے جتنا کہ بچوں کو بہلانے اور انہیں متوجہ رکھنے کے لئے ضروری ہو۔ گویا بچوں پر بوجھ لادنے کے بجائے نرسری سکول کو چاہئے کہ وہ بچوں کو اس بے جا نگرانی اور مداخلت سے نجات دلائے جو چھوٹے گھروں میں کم وبیش ناگزیر ہوتی ہے۔

غریب والدین کے شہری بچوں کی بعض ایسی جسمانی اور نفسیاتی ضروریات ہوتی ہیں جن کو گھر پر پورا نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے پہلی ضرورت تو روشنی اور ہوا کی ہے۔ تعلیم کی ایک ماہر خاتون مارگریٹ میکملن کا مشاہدہ یہ ہے کہ اس کے نرسری سکول میں داخلہ لینے والے بہت سے بچے جب پہلے پہل آئے تھے تو سوکھے کے روگ کا شکار تھے۔ لیکن کھلی ہوا میں رہنے سے ان کی یہ بیماری جاتی رہی۔

دوسری ضرورت کا تعلق مناسب خوراک سے ہے۔ اس قسم کی خوراک زیادہ مہنگی نہیں ہوتی اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ گھر ہی میں مہیا کی جا سکتی ہے۔ جس بات نے مناسب خوراک کے حصول کو مشکل بنا دیا ہے وہ لاعلمی اور کھانے پکانے کے معاملے میں قدامت پسندی کا رواج ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

تیسری ضرورت کشادہ فضا ہے جس میں بچے کھیل کود سکیں۔ بہت غریب لوگوں کے بچوں کو اس قسم کی جگہ گلی کوچوں میں ملتی ہے جب کہ دوسروں کو ایسا کرنے کے ممانعت ہوتی ہے۔ بہرطور گلیاں کھیلنے کے لئے بہترین جگہ تو ہرگز نہیں ہیں..... چوتھی ضرورت غل غپاڑہ مچانے کی ہے۔ بچوں کو شور مچانے سے روکنا زیادتی ہے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ اگر کسی گھر میں بہت سے بچے مل کر شور مچانا شروع کر دیں تو بڑوں کے لئے وہ گھر جہنم بن جاتا ہے۔ بچوں کی پانچویں ضرورت ہم جولی بچوں کے ساتھ میل ملاپ ہے۔ یہ ضرورت بچہ عمر کے دوسرے برس کے خاتمے کے قریب محسوس کرنے لگتا ہے۔ پھر یہ ضرورت تیزی سے بڑھنے لگتی ہے۔

چھٹی ضرورت والدین کی توجہ و دلچسپی سے نجات پانا ہے۔ امیر لوگوں کے بچوں کو اس کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ غریبوں کا معاملہ مختلف ہے۔ غریب والدین کو محنت مزدوری سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ ہر وقت بچوں کے سر پر سوار رہیں۔ ساتویں ضرورت ایسا ماحول ہے، جس میں بچے کا دل بہلانے کے لئے مناسب ساز و سامان موجود ہو اور ساتھ ہی ساتھ اس ماحول کو مصنوعی طور پر محفوظ بھی بنا دیا گیا ہو۔ مثلاً اس میں پتھر کی سیڑھیاں، نوکدار کونے یا قیمتی نازک چیزیں موجود نہ ہوں۔ جن بچوں کی چھ برس کی عمر تک یہ تمام ضرورتیں پوری نہ ہو سکیں، وہ عام طور پر بیمار، پست حوصلہ اور بے چین رہتے ہیں۔

بڑے شہروں میں چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کے مسئلے پر جدید حکومتوں نے ابھی تک مناسب توجہ نہیں دی ہے۔ اس معاملے میں صرف وی آنا کی میونسپلٹی کا معاملہ مختلف ہے۔ بڑی حد تک اس مسئلے کا تعلق فن تعمیر سے ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ شہروں میں زیادہ غریب لوگوں کے علاقوں میں رہنے سہنے کے کمرے ایک کھلے صحن کے تین اطراف میں بنائے جائیں اور جنوب کی کھلی جگہ کو دھوپ کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ مرکزی جگہ بچوں کے لئے مخصوص ہونی چاہئے جو وہاں بڑوں کی نگرانی میں کھیلیں کودیں اور کھانا کھائیں اور سونے کے لئے والدین کے پاس واپس چلے جائیں۔ اس سے ایک طرف تو ماؤں کو سکون ملے گا اور بچوں کو بہت زیادہ فائدہ بھی پہنچے گا۔ تاہم ہماری موجودہ صورتحال یہ ہے کہ ہم الگ تھلگ گھروں میں رہنا چاہتے ہیں۔ ہماری یہی خواہش فنِ تعمیر پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔

میرے خیال میں یہ بات لازماً فرض کی جا سکتی ہے کہ امیر لوگ اپنے بچوں کو

http://muftbooks.blogspot.com/

اس قسم کی مشترکہ کھیل کے میدانوں کی خوشیوں میں شریک ہونے کی اجازت نہ دیں گے۔ تاہم غریب لوگوں کے بچوں کی طرح امیروں کے بچوں کو بھی دن کا بیشتر حصہ آزادی کی فضاؤں میں بسر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی شہری مکان چاہے وہ کتنا ہی شاندار کیوں نہ ہو، وہ بچوں کی صحت مند ذہنی اور جسمانی نشو ونما کے لئے درکار تمام ساز وسامان مہیا نہیں کرسکتا۔ بڑی بڑی فیسیں ادا کر کے سماجی امتیاز کو اگرچہ برقرار رکھا جا سکتا ہے، تاہم ہر سماجی طبقے کے لئے کسی نہ کسی قسم کا نرسری سکول ضرور ہونا چاہئے۔

اب تک ہم اس امر پر غور کرتے آئے ہیں جس کو سکول جانے سے پہلے کے برس کہا جاتا ہے۔ جوں جوں بچے بڑے ہوتے ہیں، بورڈنگ سکولوں کے حق میں دلائل بھی مضبوط تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مضبوط ترین دلیل تو یہ ہے کہ بورڈنگ سکول دیہی علاقوں میں قائم ہو سکتے ہیں، جہاں انہیں بہترین ماحول میسر آتا ہے۔ اس کے برعکس عام سکول تو شہروں کے اندر ہی قائم ہو سکتے ہیں۔ ایک اور دلیل جو تمام نہ سہی لیکن اکثر صورتوں میں صادق آتی ہے یہ ہے کہ گھر غالباً ایسی جگہ ہے جس میں بچے کے اعصاب پر دباؤ پڑنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ مثلاً ممکن ہے کہ والدین آپس میں لڑتے جھگڑتے ہوں، ماں زیادہ حساس ہو، باپ سخت گیر ہو یا پھر زیادہ لاڈلا بھائی یا بہن ہو جو دوسرے بچوں کے لئے حسد کا سبب بنتے ہوں۔ ماں باپ میں سے کوئی ایک زیادہ ہی مہربان ہوسکتا ہے۔ خیر کسی نہ کسی بہانے سے گھر اکثر اوقات زیادہ ہی جذباتی جگہ ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں بچوں کو پرسکون اور خاموش زندگی کی ضرورت ہوتی ہے..... یعنی ایسی زندگی جس میں خوشیاں اور سرگرمیاں تو ہوں لیکن شدید قسم کے جذبات کم ہی ہوں۔ ان باتوں کے برخلاف میرے خیال میں ہمیں لازماً یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ بچے کے لئے ماں باپ کی کسی حد تک عقل مندانہ محبت اچھی ہوتی ہے اور وہ بچے کو تحفظ اور انسان ہونے کی حیثیت سے اس کی قدر و قیمت کا احساس دلاتی ہے۔ ان دو متضاد باتوں کے مابین توازن قائم کرنا آسان نہیں ہے۔

آج کے زمانے میں گھر نوجوانوں کی ذہنیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ کردار گو مکمل طور پر اچھا نہ ہو، لیکن اس کردار سے بہتر ضرور ہے جو ریاست اس وقت ادا کرتی جب سب بچے اس کی تحویل میں ہوتے۔ گھر بچوں کو پیار محبت کا تجربہ عطا کرتا ہے اور ساتھ ہی ایسی چھوٹی جماعت کا تجربہ بھی مہیا کرتا ہے جس میں بچے کو اہمیت

http://muftbooks.blogspot.com/

حاصل ہوتی ہے۔

اس طرح گھر بچے کو دونوں اضاف کے اور مختلف عمر کے افراد نیز بالغ زندگی کی منوع مصروفیات کے تجربے سے بھی روشناس کراتا ہے۔ اس لحاظ سے گھر سکول کی مصنوعی سادگی سے نجات دلانے میں مفید ثابت ہوتا ہے۔

گھر کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ افراد کے درمیان تنوع کو برقرار رکھتا ہے۔ اگر ہم سب ایک جیسے ہوتے تو پھر شاید حکام کے لئے اور اعداد و شمار جمع کرنے والوں کے لئے بہتر ہوتا۔ لیکن اس صورت میں زندگی بھدی اور غیر دلچسپ ہوتی اور اس کے نتیجے میں بہت ہی غیر ترقی پذیر معاشرہ معرض وجود میں آتا۔ موجودہ زمانے میں گھروں کے باہمی فرض افراد کے باہمی امتیازات میں بڑی حد تک شدت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس قسم کا زیادہ فرق سماجی استحکام کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔ البتہ تعاون کی بہترین صورت کے لئے قدرے فرق کا موجود ہونا لازمی ہے۔ آرکسٹرا کو ہی لیجئے۔ اس کے لئے مختلف صلاحتیوں کے حامل اور مخصوص حدود کے اندر مختلف ذوق رکھنے والے افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر سب لوگ ایک ہی ساز بجانے پر اصرار کرنے لگیں تو آرکسٹرا کی موسیقی محال ہو جائے۔ سماجی تعاون کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اس کے لئے ذوق اور میلانات میں فرق درکار ہوتا ہے۔ اب اگر بچوں کو مکمل طور پر ایک جیسے اثرات کے ماتحت رکھا جائے تو پھر اس قسم کے فرق کو نقصان پہنچتا ہے۔ میرے خیال میں یہ بات افلاطون کے اس نظریئے کے خلاف ایک مضبوط دلیل ہے کہ تمام بچوں کی پال پوس ریاست کے ذریعے ہونی چاہئے۔

ہماری موجودہ دنیا میں خاندان کے علاوہ دو اور ادارے ہیں جو نو جوانوں سے سروکار رکھتے ہیں۔ ریاست ان میں سے ایک ہے جب کہ دوسرا ادارہ مذہب یا چرچ ہے۔ برطانیہ میں صورتِ حال یہ ہے کہ اس کے مزدوروں کے لگ بھگ دو تہائی بچوں کی تعلیم حکومت کی طرف سے ہوتی ہے۔ جب کہ بقیہ ایک تہائی بچوں کی تعلیم مختلف مذہبی اداروں اور خصوصاً اینگلیکن اور رومن کیتھولک اداروں میں ہوتی ہے۔ ان کے مقابلے میں خوشحال خاندانوں کے بچے زیادہ تر اینگلیکن ماحول میں تعلیم پاتے ہیں۔ لڑکیوں کے اکثر ''بہترین'' سکول اینگلیکن یا کیتھولک ہیں۔ بالائی اور متوسط طبقے کی تعلیم پر مذہب کی گرفت بڑھتی جا رہی ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

مذہب اور حکومت دونوں کی موجودہ صورتیں تعلیمی عوامل کی حیثیت سے بعض خامیوں کی حامل ہیں۔ آئندہ ابواب میں ہم ان خامیوں کا مفصل ذکر کریں گے۔ یہاں مختصراً میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مذہب اور حکومت دونوں ہی بعض ایسے عقیدوں کو قبول کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں جن کو کوئی غیر متعصب شخص قبول نہیں کرسکتا۔ اسی طرح وہ ایک ایسی اخلاقیات ٹھونسنا چاہتے ہیں جو اس قدر ظالمانہ ہے کہ اسے صرف وہی لوگ قبول کر سکتے ہیں جن کے انسانی جذبات کو مذہبی عقیدے نے کچل دیا ہو۔

ابھی ہم نے جن ناقابل قبول عقیدوں کا ذکر کیا تھا، ان کی وضاحت کے لئے چند مثالیں ہم پیش کرتے ہیں۔ پہلی مثال تو لیجئے کہ رومن کیتھولک چرچ کا ایمان یہ ہے کہ کوئی پادری لاطینی کے چند جملے روٹی پر پھونک کر اسے حضرت عیسٰی کے گوشت اور خون میں تبدیل کرسکتا ہے۔ برطانوی حکومت کا دعویٰ یہ ہے کہ تاج برطانیہ محکوم اقوام کے لئے ایک نعمت ہے۔ اچھا اگر اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ نوجوان اس قسم کی باتوں میں یقین رکھیں تو پھر انہیں احمق بنائے رکھنا ضروری ہے۔ ساتھ ہی انہیں بعض اطراف میں اپنی عقلی قوتوں کو بروئے کار نہ لانے کا درس بھی دینا چاہئے۔

ظالمانہ اخلاقیات کی چند مثالیں یہ ہیں: رومن کیتھولک چرچ اس قسم کا قانون بنوانے کے درپے ہے کہ اگر کوئی عورت کسی آتشک زدہ مرد سے حاملہ ہو جائے تو اسے مصنوعی طریقے سے وضع حمل کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ اس کے بجائے بیچاری عورت کو ایسا بچہ پیدا کرنے پر مجبور کرنا چاہئے جو غالباً آتشک جیسی موذی مرض کا شکار ہوگا تاکہ وہ بچہ دکھ اور مصیبت کے چند برس اس دھرتی پر گزارنے کے بعد ہمیشہ کے برزخ میں رہے (بشرطیکہ اس کے ماں باپ کیتھولک نہ ہوں)۔ برطانوی ریاست کے نزدیک ہر انگریز کا فرض یہ ہے کہ جب کبھی پارلیمنٹ میں جمع ہونے والے چند بزرگ حکم دیں تو وہ غیر انگریزوں کی قتل وغارت شروع کردے۔

یہ چند مثالیں اس امر کی وضاحت کے لئے کافی ہیں کہ ریاست اور مذہب عقل اور نیکی کے جانی دشمن ہیں۔

ان حالات میں تعلیم پر گھر کے اثرات کو اس وقت تک ختم کرنا خطرناک ہے جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو جائے کہ کون سا عامل اس کی جگہ لے گا۔ ہاں اگر مذہبی اثرات

http://muftbooks.blogspot.com/

سے پاک عالمی ریاست وجود میں آجائے تو پھر شاید نوجوانوں کے لئے گھر کی قدر و قیمت کم ہو جائے گی اور یہ توقع کی جا سکے گی کہ والدین کے اثر و رسوخ کے خاتمے سے بچوں پر خوش گوار اثر پڑے گا اور وہ پہلے سے زیادہ خوش اور زیادہ ذہین ہو جائیں گے۔ جہاں تک موجودہ حالات کا تعلق ہے، سوویٹ یونین کے سوا، ہر جگہ ترقی مذہب اور ریاست کی مخالفت کے بعد ہی ممکن ہوتی ہے۔ لہٰذا جو شے بھی انسانی ذہن پر ان دونوں کو گرفت کو مضبوط کرنے والی ہو، اسے تشویش سے دیکھنا چاہئے۔

یہ سوال کہ آیا بچوں کو والدین سے جدا کرنا چاہئے اور ان کی پال پوس ریاست کے ذریعے ہونی چاہئے، ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر نہ صرف بچوں بلکہ والدین کے حوالے سے بھی غور و فکر ہونا چاہئے۔ ماں اور باپ کے احساس کا عورتوں اور مردوں دونوں کے کردار پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اعداد و شمار دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ہم یہ کہنے کے قابل نہیں ہیں کہ اس احساس کو ختم کر دینے کی صورت میں عورتوں اور مرد کس قسم کے انسان بن جائیں گے۔ بہر طور ہم یہ قیاس ضرور کر سکتے ہیں کہ وہ بڑی حد تک بدل جائیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس قسم کے حالات میں عورتیں بچوں کی کم ہی خواہش محسوس کریں گے اور بچے جننا ایک اجرتی پیشہ بن جائے گا جس کو شاید سول سروس کی ایک شاخ کے طور پر قبول کیا جائے گا۔ ساتھ ہی ساتھ عورت اور مرد کے تعلقات بے کیف اور سطحی ہو جائیں گے اور گہری ازدواجی محبت نایاب ہو جائے گی۔ اس امر کا بھی امکان ہے کہ اس صورت میں مرد سخت محنت سے کترانے لگیں گے کیونکہ آج کل عمر کے درمیانے حصے میں اکثر مرد اپنے خاندانوں کی پال پوس کے لئے ہی زیادہ تر محنت کرتے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ زندگی کے بیمے کی بڑی بڑی رقوم ادا کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی انہیں اپنے اہلِ خانہ کی فکر رہتی ہے۔ یہ بات مشکوک ہی ہے کہ اگر خاندان کا وجود نہ رہے تو عام لوگ پھر بھی اپنی موت کے بعد وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے کوئی دلچسپی رکھیں گے۔ اس صورت میں ممکن یہ ہے کہ پورے معاشرے پر ایک قسم کی بے بسی و معذوری چھا جائے گی..... یعنی اس قسم کی کیفیت جیسی شہد کے چھتے کی ملکہ کے مرنے پر شہد کی مکھیوں پر طاری ہو جاتی ہے۔ اس بارے میں حتمی فیصلہ بہر حال تجربے کی بناء پر ہی ہو سکتا ہے اور ابھی تک تجربہ مفقود ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

خیر، اس مسئلے کے دوسرے پہلو پر بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ تمام ملکیتی جذبے خطرناک ہوا کرتے ہیں۔ بچوں کے بارے میں ان کے والدین کے احساسات بھی ایسے ہی ہیں۔ یہ احساسات بہت زیادہ انفرادی اور مسابقانہ ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ جب تک بچوں سے محروم ہوتے ہیں، اجتماعی جذبے سے سرشار رہتے ہیں لیکن جن کے اپنے بچے ہو جاتے ہیں تو ان کی ساری توجہ اپنے خاندان کی فلاح و بہبود تک ہی محدود ہو جاتی ہے۔ نجی ملکیت کا جذبہ بڑی حد تک خاندان سے منضبط ہے۔ اسی لیے افلاطون کے زمانے سے کمیونسٹ بجا طور پر یہ سوچتے رہے ہیں کہ ان کا معاشی نظام بچوں کو نجی ملکیت کے انتقال کے خاتمے کا متقاضی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ والدین کے جذبے کے قابل تعریف اور مفید حصے کو کسی خاص سکول میں کسی طرح بچوں کو منتقل کر دیا جائے۔ اگر ایسا ہو سکے تو یہ ایک یقینی اخلاقی پیش رفت ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ماں باپ کا جذبہ ایثار اور دوسروں کی بے لوث خدمت کا نمایاں سرچشمہ ہے اور بہت سی بے اولاد خواتین نے اس حقیقت کو اُجاگر کر دیا ہے کہ جب اس جذبے کو عام کر دیا جائے تو وہ کس قدر قابلِ قدر ہو سکتا ہے۔ اگر اس جذبے کو ملکیت کے رجحان سے آزاد کر دیا جائے تو دنیا کی خونخواری کسی حد تک کم ہو جائے اور لوگ صرف اپنی اور اپنے اہلِ خانہ کی بہبود کو پیشِ نظر رکھنے کے بجائے سب کی بھلائی کی خواہش کرنے لگیں گے۔ بلاشبہ یہ سب کچھ محض قیاسی ہے، تاہم یہ ایک ایسا مفروضہ ہے جسے ذہن نشین رکھنا چاہیے۔

گھر اور سکول کے موازنے کا مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر کسی حد تک بنیادی سوالات اُٹھائے بغیر محض فہم عامہ کی بنیاد پر فیصلہ دیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب ہم اس حد سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو پھر انسانی نفسیات سے اپنی لاعلمی سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ہمارے احساسات کا کس قدر حصہ جبلی ہوتی ہے۔ نہ ہی ہمیں یہ علم ہے کہ اگر ہمارے جذبات کی صورت بدل جائے تو ان کی شدت کس قدر برقرار رہے گی۔ توقع کرنی چاہیے کہ سوویٹ یونین کچھ عرصہ بعد ایسے اعداد و شمار مہیا کر سکے گی جو ہمیں ان مسائل کے بارے میں زیادہ جاننے کے قابل بنا سکیں گے۔ اس وقت تک واحد سائنسی رویہ یہ ہے کہ ہم اپنا فیصلہ ملتوی رکھیں۔

❁❁❁

http://muftbooks.blogspot.com/

چھٹا باب

امراء، جمہوریت پسند اور افسر شاہی

ریاست جب سے وجود میں آئی ہے، خاندان اور ریاست دو مخالف قوتیں رہی ہیں۔ صرف کسی شاہی خاندان ہی میں ان دونوں قوتوں کے مابین جذباتی ہم آہنگی پیدا ہو سکتی تھی۔ نتیجے کے طور پر اس مفروضے نے جنم لیا کہ قوم کی حیثیت ایک بڑے خاندان جیسی ہے جس کا سربراہ بادشاہ ہے۔ یہ نظریہ چین، جاپان، میکسیکو اور پیرو کے علاوہ ان تمام علاقوں میں بھی غالب رہا جن میں خدائی بادشاہت کا تصور مضبوط تھا۔ اس طریقے سے ایک مضبوط ریاست پیدا کی جا سکتی تھی۔ انسانوں کا آداب وفاداری سکھانے والا جذبہ جزوی طور پر مذہبی تقدس اور کسی حد تک خاندان کے سربراہ کے احترام کا جذبہ تھا۔ لاشخصی ریاست اہلِ یونان اور خاص طور پر اہلِ روم کی تخلیق تھی۔ بروٹس کا اپنے بیٹوں کو عوامی مفاد کے لئے قربان کر دینا ایک ایسی داستان ہے جس کو ہم مفاد عامہ کے مذہب کا عنوان دے سکتے ہیں۔ جہاں تک دنیائے مشرق کا تعلق ہے اس میں یہ مذہب بالکل نیا ہے اور اصل میں یورپی اثرات کی پیداوار ہے۔ چینی فلسفی کنفیوشس نے فرزندانہ سعادت مندی کو جان بوجھ کر قانون سے بالاتر رکھا تھا۔ اس نے ایک ایسے بیٹے کو لعن طعن کی تھی جس نے اپنے مجرم باپ کو انصاف کے سپرد کر دیا تھا۔ جاپان میں ابھی تک جذبہ حب الوطنی میں خاندان کے آسمانی سربراہ کے ساتھ محبت وعقیدت کی قدیم صفات پائی جاتی ہیں۔ عقل پرستی کے رجحان کے زیرِ اثر جب یہ جذبہ زوال کا شکار ہوگا تو پھر شاید جاپانی سیاسی نظام بھی برقرار نہ رہ سکے گا۔ تب شاید وہاں روسی نمونے کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ چین میں قدیم خاندانی جذبے کی جگہ جدید طرز کے جذبہ حب کو تخلیق کرنے کی مسلسل کوشش ہوتی رہی ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں سے نفرت کے سبب جدید انداز کا حب الوطنی کا جذبہ

http://muftbooks.blogspot.com/

نشو ونما پاتا رہا ہے۔ لیکن یہ تمام ملک چونکہ رومی روایت سے محروم ہیں، اس لئے وہاں حب الوطنی کو، جیسا کہ مغربی لوگ اسے سمجھتے ہیں، ابھی کسی حد تک اجنبی خیال کیا جاتا ہے۔

عہد حاضر میں برطانیہ کے بالائی طبقے میں وہ جذبہ ملتا ہے جسے رومی جذبے کے قریب ترین قرار دیا جا سکتا ہے۔ باقی تمام جگہوں پر انقلاب فرانس کے زمانے تک ریاست کا تصور ایک بادشاہ کا سا تھا۔ انگلستان کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں چارلس اول کے قتل کے بعد عوام کے ذہنوں میں بادشاہ اور ریاست ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ ہو گئے تھے۔ 1688ء سے 1832ء تک کے تمام عرصے میں انگلستان درحقیقت ایک اشرافیہ جمہوریت تھا۔ جس میں حکمران خاندانوں میں عوامی اُمور کا کم وبیش ویسا ہی جبلی فہم پایا جاتا تھا جیسا کہ سلطنت روم کی عظمت کے دنوں میں رومیوں میں موجود تھا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ انگلستان یا روم میں امرا اپنے ذاتی مفادات سے کسی قدر بے نیاز ہو گئے تھے۔ ہم جانتے ہی ہیں کہ چھوٹے بروٹس نے، جسے جمہوری وصف کا کڑا نمونہ خیال کیا جاتا ہے، ایک میونسپلٹی کو ساٹھ فیصد سود پر روپیہ مہیا کیا تھا اور جب اس شہر کے لوگ سود ادا کرنے میں ناکام رہے تو بروٹس صاحب نے ایک نجی فوج باڑے پر حاصل کر کے ان کا محاصرہ کر لیا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے بالائی انگریز طبقے نے پارلیمینٹ کے دونوں ایوانوں پر اپنے غلبے کو انکلوژر ایکٹس کے ذریعے عوام کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کی خاطر استعمال کیا تھا۔ اس کے باوجود ان دونوں مثالوں میں ایک ایسے طریقے سے ریاست کو حکمران طبقوں نے اپنی ذاتی جاگیر خیال کیا تھا کہ آج کی وسیع وعریض جمہوریتوں میں شاید ہی کوئی شخص ایسا کر سکے۔

ہر سماجی نظام اپنے تقاضوں کے مطابق ایک موزوں تعلیمی نظام پیدا کرتا ہے۔ انگریز امرا کی حکومت نے اس حوالے سے پبلک سکولوں کا نظام وضع کیا تھا۔ ان میں ایلٹن کا سکول سرفہرست تھا جو کمتر درجے کے سکول تھے، ان میں ہے رو، ونچسٹر اور رگبی کے سکول شامل تھے۔ ان سکولوں کی کارگزاری کے حوالے سے اٹھارہویں صدی کے انگریز امرا کی ذہنیت پوری انیسویں صدی کے دوران گہری آئینی تبدیلیوں کے باوجود سیاسی اقتدار و قوت کے مالکوں کی سی رہی۔ برطانیہ میں پبلک سکول اب بھی قائم ہیں اور اکثر امیر انگریز انہیں اپنی بہترین روایات کا مظہر خیال کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات اب بھی ضروری ہے کہ

http://muftbooks.blogspot.com/

ہماری یعنی انگریزوں کی قومی زندگی میں ان کے کردار کا جائزہ لیا جائے۔

نفسیاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو ابتدائی اور پبلک سکول سسٹم کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ وہ ابتدائی عمر ہی میں بچے کو گھر سے اور ہر قسم کے عورتوں کے اثرات سے جدا کر دیتے ہیں۔ یوں وہ بچے کو زیادہ عمر کے لڑکوں اور خود اس کے ساتھیوں کی امکانی بدسلوکی کا بے یار و مددگار نشانہ بننے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ شروع میں تو وہ شاید بہت ناخوش ہوتا ہے لیکن اگر وہ زیادہ حساس یا زیادہ ذہین نہیں تو پھر وہ حالات کا بتدریج مقابلہ کرنا سیکھ جاتا ہے۔ وہ سکول کی زندگی میں دیگر تمام مقاصد سے بڑھ کر قوت اور شان و شوکت کو اپنا مقصد بناتا ہے۔ اگر وہ اچھا کھلاڑی ہے تو اسے ایسی آبرو حاصل ہو جائے گی جو بعد کی زندگی میں اسے نصیب نہ ہوگی۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ کھیل کے میدان میں قومی اہمیت کا کوئی کارنامہ سرانجام دے۔ تب اسے پھر سے عزت و احترام میسر آئے گا۔ سکول کے آخری برسوں کے دوران نوجوان کو اپنے سے چھوٹے بچوں کا احترام ملتا ہے اور ان پر اسے کسی قدر برتری بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ اپنے ابتدائی رنج فراموش کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ نوجوان چالیس برس کی عمر کو پہنچتا ہے تو یہ سمجھنے لگتا ہے کہ سکول میں گزرے ہوئے دن اس کی زندگی کے بہترین ایام تھے لیکن ان بیتے ہوئے ایام میں جو خوشی اسے حاصل تھی وہ ایک لاحاصل بالادستی اور غیر اہم خوبیوں کے لئے ملنے والی تعریف و تحسین کا ثمر تھی۔ فطری طور پر وہ سکول سے بعد کی زندگی میں ابھی اسی نوع کی مسرتوں کے مواقع کی جستجو کرتا ہے۔ وہ لوگوں کی خواہش کرتا ہے تاکہ ان پر حکم چلا سکے۔ وہ ایسے لوگوں کا متلاشی ہوتا ہے جو اسے نیم دیوتا کا درجہ دیں۔ لہٰذا وہ غیر متمدن لوگوں کے درمیان رہنے کے لئے چلا جاتا ہے..... یا کم از کم ایسے لوگوں کے پاس جن کو وہ خود پسماندہ خیال کرتا ہے۔ وہ سلطنت کا بانی اور تہذیب و تمدن کا ستون بننا چاہتا ہے، تاریکی مقامات تک مغربی تہذیب کی روشنی اور برکات پہنچانے والا بننے کے خواب دیکھتا ہے۔ اب اگر ''مقامی'' لوگ اس سے ویسا ہی سلوک کریں جیسا کہ سکول کے آخری زمانے میں چھوٹے لڑکے اس کے ساتھ کرتے تھے، تو بس سمجھ لیجئے کہ بیڑا پار ہو گیا۔ وہ مطمئن ہو کر مہربان، دیانت دار اور محنتی رہتا ہے۔ تنہائی اور بے آرامی کے روگ کو بے نیازی سے برداشت کرتا ہے کہ یہ روگ ان مصائب سے بڑا نہیں جن کا اس کو سکول کے ابتدائی

http://muftbooks.blogspot.com/

زمانے میں سامنا تھا۔

''مقامی'' لوگ اگر اس کی تعریف وتحسین نہ کریں تو معاملہ الٹ جاتا ہے۔ وحشیوں کے درمیان، جہاں اس کی برتری غیر مشتبہ ہوتی ہے، وہ اپنی جرآت اور برداشت کے سبب اکثر اوقات کامیاب رہتا ہے لیکن جب اس کا سامنا کسی دوسری تہذیب سے، جیسے مثلاً مشرق کی تہذیبوں سے ہوتو اس کی حالت قابلِ رحم ہوتی ہے۔ مشرق میں مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو اپنے آپ کو پبلک سکولوں کی تعلیم کا خوبصورت پھل خیال کرتے تھے۔ لیکن جب ان کا پالا مشرق کے تعلیم یافتہ لوگوں سے پڑتا ہے تو ان کی حالت دیکھ کر مجھے اپنے انگریز ہونے پر شرم آتی ہے۔ میرے ہم وطن سرخ چہرہ ہو سکتے ہیں، وہ بلانوش ہو سکتے ہیں، وہ کام کاج کے اوقات استحصال کرنے اور فرصت کے لمحات کھیل کود میں صرف کر سکتے ہیں۔ وہ مغربی تہذیب سے نا آشنا ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں یہ بھی معلوم نہ ہو کہ کوئی مشرقی تہذیب وجود رکھتی ہے۔ اس کے باوجود جب ان کا سامنا ایسے لوگوں سے ہوتا ہے جو نہ صرف اپنی تہذیب وتمدن کا علم رکھتے ہیں بلکہ مغربی تہذیب کے بارے میں بھی ان کا علم پبلک سکولوں کے اکثر فارغ التحصیل لوگوں سے زیادہ ہوتا ہے، تو پھر یہ اُجڈ گنوار فوجی فاتحین کی سرکشی کو برقرار رکھتے ہیں اور اس پر قناعت کرتے ہیں کہ ان کے جہازوں کی توپیں ان کی بالادستی کو ثابت کر سکتی ہے۔ اہلِ جاپان نے اس حقارت انگیز وحشت وبربریت کا جواب ہمارے معیار جیسا کر دیا ہے۔ مشرق کی دیگر اقوام ان کے نقش قدم پر چل رہی ہیں۔ گویا بات یہ ہوئی کہ سامراج کے انجن کی حیثیت سے پبلک سکول ناکام ہو گئے ہیں۔

اس ناکامی کے اسباب کچھ تو عقلی ہیں اور کچھ نفسیاتی۔ آیئے ہم عقلی اسباب سے بحث کا آغاز کریں جو سطح سے قریب تر ہیں۔ پبلک سکولوں کی روح میں عقل سے حقارت ہے۔ خاص طور پر سائنسی عقل وذہانت سے انہیں خدا واسطے کا بیر ہے۔ ان سکولوں کے اساتذہ کا انتخاب زیادہ تر ان کی ورزشی صفات کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ کم از کم ظاہری طور پر انہیں ایک مکمل ضابطہ کردار کی پیروی کرنا پڑتی ہے۔ اس ضابطے میں مذہبی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی سبھی اُمور شامل ہوتے ہیں۔ اکثر ذہین لوگوں کے لئے یہ ضابطہ ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ پھر ان اساتذہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ لڑکوں کو اس طرح مسلسل

http://muftbooks.blogspot.com/

مصروف رکھیں گے کہ جنسی گناہ کے لئے ان کے پاس کوئی وقت ہی باقی نہ بچے ..... بلکہ سوچ بچار کے لئے بھی کوئی وقت ان کے پاس نہ رہے۔ زیادہ ہوشیار طالب علموں میں اگر آزادی کے کوئی آثار اگر باقی رہ جائیں، تو ان کو ختم کرنے پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ ان اساتذہ کا فرض یہ ہوتا ہے کہ آخر کار وہ ایسی مکمل شے تیار کریں گے جو اس قدر ظاہر پرست ہو کہ بقیہ ساری زندگی میں کسی اہم چیز کے سیکھنے کی صلاحیت ہی اس میں باقی نہ رہے۔ برطانوی پبلک سکولوں کی یہ چند عقلی خامیاں ہیں ..... ان خامیوں کو ہم اس حقیقت سے جدا نہیں کر سکتے کہ پبلک سکولوں کے قیام کا مقصد ہی ایک ایسے نظام کو سہارا دینا ہے جس کا عقلی طور پر دفاع نہیں کیا جا سکتا۔

ابتدائی اور پبلک سکولوں کے نفسیاتی نقائص زیادہ تر دو وجوہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکوں کو نسوانی رفاقت سے محرومی ہے اور دوسری وجہ روایتی ضابطہ اخلاق ہے۔ پہلے پہل چھوٹے لڑکے ناگزیر طور پر ماں، بڑی بہنوں اور حتیٰ کہ نرسوں کی محبت سے محرومی کو محسوس کرتے ہیں۔ اس ماحول میں ان کے لئے مائیں پوشیدہ خواہش اور پرستش کا مرکز بن جاتی ہیں۔ یہ جذبہ یوں اور بھی شدید ہو جاتا ہے کہ تمام عورتوں سے نفرت کو آداب مردانگی خیال کیا جاتا ہے۔ بلوغت کے بعد ان سکولوں کے لڑکے جلق یا ہم جنسیت کی طرف یا پھر ان دونوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کو اس حوالے سے گناہ گار رہنے کا احساس بھی رہتا ہے۔ وہ یہ کام چوری چھپے کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کیونکہ سب لوگ جنسی لغزشوں کو خوفناک قرار دیتے ہیں۔ یہ صورت احوال ان میں سے اکثر کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنی ماں کے تصور کو ایک ایسی عورت کے طور پر قبول کر لیں جو پاک محبت کی خالق ہے۔ اس قسم کا احساس اکثر اوقات پر مسرت ازدواجی زندگی کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان ہر اس عورت سے حقارت کے ساتھ پیش آنے لگتا ہے جس کے ساتھ جنسی تعلق کو ممکن سمجھتا ہے۔ اس نفسیاتی الجھن سے پیدا ہونے والا رنج جبر و تشدد کا رجحان پیدا کرتا ہے اور صرف قوت ہی کو مسرت کا دستیاب وسیلہ ٹھہراتا ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ سامراج پرستوں کی ذہنیت جنسی تسکین کی محرومی سے پیدا ہونے والے امراض کی بنا پر اور بھی مضبوط ہو جاتی ہے۔

انگریزی پبلک سکولوں کے نقائص کو شاید اشرافیہ کے نظام تعلیم سے جدا نہیں کیا جا

http://muftbooks.blogspot.com/

سکتا۔ جہاں کہیں موروثی سماجی شان کا حامل طبقہ موجود ہوگا، وہاں اس قسم کے اکثر نقائص بھی موجود رہیں گے۔ اس طبقے کا بڑا مقصد قوت و اقتدار کا حصول ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ ذہانت یا احساس کے بجائے قوت ارادی کو پروان چڑھاتا ہے اور اپنے تربیتی پروگرام میں رہبانیت کے وہ عناصر لازماً شامل کرتا ہے جو ارادے کو مضبوط تر بنانے والے ہوتے ہیں۔ دولت کے زیر اثر ماضی کے امرا کے طبقے یا تو عیش پرستی کا شکار ہو جاتے تھے یا وہ آزاد خیالی کے فروغ کے آگے جھک جاتے تھے۔ ان خطرات کے آگے بند باندھے بغیر کوئی اشرافیہ زیادہ عرصے تک اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتی۔ پس انگریزی پبلک سکولوں کی اچھائیاں اور برائیاں اصل میں طبقہ امرا کی تعلیم و تربیت کے لئے ضروری ہیں۔

اشرافیہ کے دن بیت چکے ہیں لیکن برطانیہ نے اب بھی اسے سینے سے لگا رکھا ہے۔ تفصیل کی کسی غلطی کے بجائے محض اس وجہ سے برطانیہ کے اہم پبلک سکول ایٹن کی اب وہ قدر و قیمت نہیں رہی جو سو ڈیڑھ سو سال پہلے تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیائے جدید میں اشرافی طرز کے نظام تعلیم کے لئے اب کوئی جگہ نہیں رہی۔

جمہوری تعلیم بھی خامیوں سے مبرا نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی کمزوریاں اتنی ہی بڑی ہیں جتنی کہ اشرافیہ کے نظام تعلیم کی ہیں۔ ایک جذبے کی حیثیت سے جمہوریت کے دو پہلو ہیں۔ جب یہ جذبہ یہ کہے کہ ''میں اتنا ہی اچھا ہوں جتنا کہ آپ ہیں'' تو پھر اسے خوش گوار سمجھنا چاہئے لیکن جب وہ یہ کہے کہ ''آپ مجھ سے بہتر نہیں ہیں'' تو وہ جابرانہ بن جاتا ہے اور مثالی خوبی کی نشوونما میں رکاوٹ بھی۔

زیادہ صراحت سے بات کرتے ہوئے یوں کہئے کہ جمہوریت اچھی اس وقت ہوتی ہے جب وہ خودداری کو پیدا کرتی ہے اور اس وقت بری ہوتی ہے جب وہ گروہ کو غیر معمولی افراد کی گوشمالی پر اکساتی ہے۔ بلاشبہ اس قسم کی ایذا رسانی اشرافی سکولوں میں پائی جاتی ہے جہاں غیر معمولی قابلیت رکھنے والے طلبہ کو اکثر بہت برے سلوک کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ تاہم یہ جمہوریت ہی ہے جس کے ماتحت اس قسم کے طرز عمل نظریہ اور رواج دونوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور سکول سے آگے بڑھ کر ساری دنیا پر چھا جاتا ہے۔ غیر معمولی صلاحیتوں والے افراد کو برداشت کرنا، جو کہ برطانوی معاشرے کے بہترین اوصاف میں سے ایک ہے، اصل میں اشرافیہ سے منسوب ہے۔ مثال کے طور پر اگرچہ

http://muftbooks.blogspot.com/

برطانیہ میں بائرن اور شیلے کو معاشرے کی طرف سے مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن اگر وہ کسی جمہوری معاشرے کے شہری ہوتے تو انہیں کہیں زیادہ مصیبتیں اٹھانی پڑتیں۔ علاوہ ازیں اگر یہ دونوں صاحبان اشرافی خودداری سے محروم ہوتے تو وہ ان مصائب کو برداشت کرنے کے بہت کم قابل ہوتے۔

خیر، یہ جمہوریت کا سب سے بڑا تعلیمی نقص ہے۔ امریکہ میں جہاں جمہوری جذبہ مضبوط ہے، وہاں ایسے تعلیمی نظام تیار کرنا دشوار ہے جو زیادہ ہوشیار بچوں کو ضروری فائدے بہم پہنچاتے ہوں۔ حال ہی میں وہاں اس ضمن میں بعض اقدامات کئے گئے ہیں لیکن یہ اقدامات ان لوگوں کے مرہون منت ہیں جو جمہوریت کے مخالف ہیں۔

اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض بچے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ صلاحتیوں کے حامل ہوتے ہیں۔ اب اگر ان بچوں کو ممکنہ حد تک مطمئن اور معاشرے کے لئے مفید بنانا مقصود ہے تو پھر ان کے ساتھ اس سے مختلف برتاؤ روا رکھنا ہوگا جو عام بچوں کے لئے بہترین ہے۔ اشرافی طرز فکر کا مغالطہ یہ سوچ نہیں کہ بعض لوگ دوسروں سے بہتر ہوتے ہیں۔ اس کی اصل غلطی یہ ہے کہ وہ اس بہتری کو وراثت سے منسلک کرتا ہے۔ دوسری طرف جمہوریت کی غلطی یہ ہے کہ وہ بڑائی کے تمام دعوؤں کو ہجوم کے غصہ و ناراضگی کی جائز بنیادیں قرار دیتی ہے۔

ہماری آج کی دنیا میں معاشرے کے لئے بہت سے ضروری کام ایسے ہیں کہ جن کے کرنے کے لئے اوسط درجے سے زیادہ قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے اس قسم کے کاموں کے غیر معمولی قابلیت کے افراد منتخب کرنے کے طریقے بھی ضرور ہونے چاہئیں۔ اگر ان افراد کو ممکنہ حد تک اہل بنانا درکار ہے تو مناسب بات یہ ہوگی کہ ان کا انتخاب اس وقت کر لیا جائے جب کہ ابھی وہ نوجوان .....مثلاً بارہ برس تک لگ بھگ ہوں۔ یوں انہیں اس سے زیادہ تیزی سے پیش رفت کے مواقع مہیا کئے جائیں جتنے کہ عام لڑکوں یا لڑکیوں کی کسی جماعت میں حاصل ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ یہ خدشہ کہ بہترین نوجوانوں کو اس طرح چھانٹ کر الگ کرنا غیر جمہوری فعل ہے، بہت سے اچھے مواد کے زیاں کا سبب بنتا ہے۔ بارہویں باب میں ہم دوبارہ اس موضوع پر بحث کریں گے۔ لہٰذا یہاں اس سلسلے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ یہ نکتہ ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ اس ساری

http://muftbooks.blogspot.com/

الجھن کا منبع حکومت کے جمہوری انداز نہیں بلکہ بے قابو اور حد سے زیادہ پر جوش جمہوری جذبہ ہے۔ سیاسی اعتبار سے امریکہ کی طرح فرانس بھی جمہوری ملک ہے لیکن وہاں جوہر قابل کو خصوصی برتاؤ مہیا کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ وجہ یہ ہے کہ فرانس میں عقلی اور فنی اہلیت کا احترام کیا جاتا ہے..... اور بڑی بات یہ ہے کہ یہ احترام صرف اس وقت نہیں کیا جاتا جب کوئی فرد اپنی اس اہلیت کا لوہا منوالیتا ہے، بلکہ اس وقت بھی جب اس کی اہلیت پروان چڑھ رہی ہوتی ہے۔

لوگوں کے ذہن پر جمہوریت کو اب اس قدر وگرفت حاصل نہیں رہی جس قدر جنگ سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ یہ حقیقت اب واضح ہوگئی ہے کہ صنعتی معاشرے میں قوت کے چند مراکز ہوا کرتے ہیں۔ اگر غیر سرکاری امرا ان مراکز پر قابض نہ ہوں تو پھر سرکاری حکام ان پر فائز ہوتے ہیں۔ اس قسم کے سرکاری حکام اگرچہ تھوڑے بہت عوامی اقتدار کے ماتحت ہوتے ہیں، لیکن کئی اعتبار سے وہ ازخود اہم فیصلے کرتے ہیں۔ یوں اشراف اور امرا کی جگہ عملی طور پر افسر شاہی لے لیتی ہے۔ اب اگر ناجائز مراعات کے خاتمے کی ہر ممکن کوشش کی جائے تو بھی قوت واقتدار کی تقسیم غیر منصفانہ ہی رہتی ہے، کیونکہ یہ امر ناگزیری ہی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ قوت ان لوگوں کو منتقل ہو جاتی ہے جو اس کے سب سے زیادہ اہل ہوتے ہیں۔ یہ قوت امرا اور مطلق العنان بادشاہوں کی قوت کی طرح غیر ذمہ دارانہ نہیں ہوتی بلکہ اس پر جمہوریت کی حتمی گرفت ہوتی ہے۔ جن لوگوں کو دانائی سے اس قوت کو بروئے کار لانا ہوتا ہے، ان میں ایسی صفاتی کی موجودگی ضروری ہے جو جمہوری یا اشرافی تعلیم سے پیدا ہونے والی صفات سے مختلف ہوتی ہے۔ اس معاملے میں ایک غیر جمہوری بات ہے کہ یہ لوگ اہلیت اور علم کے لحاظ سے اوسط درجے سے بڑھ کر ہوتے ہیں جب کہ غیر اشرافی عنصر یہ ہے کہ ان کے مرتبے کا دارومدار ان کے باپ کے سماجی مقام پر نہیں بلکہ خود ان کی ذاتی اہلیتوں پر ہوتا ہے۔ مزید براں چونکہ وہ حتمی اور مطلق قوت کے مالک نہیں ہوتے، اس لئے انہیں حکمرانی کے غیر معمولی میدالن کے بجائے درست فیصلوں تک پہنچنے کی خاص صلاحیت اور ذہنی طور پر اپنے سے کی قدر کمتر افراد کو اپنے نتائج کے جواز پیش کرنے کی اہلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

دورِ حاضر کی ایجادات اور ٹیکنالوجی نے معاشرے کو زیادہ عضویاتی بنا دیا ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

جوں جوں معاشرہ زیادہ عضویاتی ہوتا جاتا ہے تو توں افسر شاہی کی اہمیت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ لہٰذا ایک سائنسی مملکت میں افسر بننے والے لوگوں کی مناسب تعلیم بہت اہم ہے۔ اس کے لئے معلمین اور تعلیمی حکام کی طرف سے بچوں میں پائی جانے والی فطری ذہانت اور اس کی رہنمائی کرنے والے ذرائع کا احترام درکار ہے۔ مزید برآں اس کے لئے زیادہ ذہین طلبہ کے لئے خصوصی جماعتوں اور ایسے نصاب کی ضرورت ہوتی ہے جو ان طلبہ کو وسعتِ نظر اور ماہرانہ علم کے لئے درکار دیگر لوازمات مہیا کر سکے۔ عام طور پر فرض یہ کیا جاتا ہے کہ مفید علم تہذیب و ثقافت مہیا نہیں کرتا۔ میرے نزدیک یہ مفروضہ محض ایک واہمہ ہے۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ پرانی تاریخ میں واقع ہونے والی جنگ سے متعلق علم تہذیب افزا ہے جبکہ سوویٹ انقلاب کے بارے میں علم لغو اور قابلِ مذمت ہے۔ اس قسم کے خیالات نہ صرف مفید علم کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں بلکہ عمدہ تہذیب کی راہ بھی روکتے ہیں جس میں ایسی وسعت اور آزادروی ہونی چاہئے جس کو نام نہاد عالم برباد کر رہے ہیں۔

افسر شاہی کی تعلیم خاص قسم کے شہریوں کی تعلیم ہوگی۔ لیکن یہ اس وقت تک مناسب تعلیم قرار نہیں پائے گی جب تک بعض علوم کو محض روایتی ہونے کی بنا پر خاص درجہ حاصل رہے گا اور علم کے بعض دوسرے شعبے صرف اس لئے غیر اہم سمجھے جائیں گے کہ مدعیان علم ان سے محروم ہیں۔ نشاۃ ثانیہ کے زمانے میں اچھے ادب کا بڑا حصہ لاطینی یا یونانی زبان میں تھا۔ اب صورتِ حال بدل چکی ہے لیکن انگریزی پبلک سکولوں کے اکثر استاد ابھی تک اس تبدیلی سے بے خبر ہیں۔ یہاں تک کہ حکومت برطانیہ بھی ابھی تک اپنے اعلیٰ ملازمین کا انتخاب زیادہ تر ان زبانوں میں مہارت کے حوالے سے کرتی ہے۔ حالانکہ فرانسیسی اور جرمن زبانوں کا علم اب زیادہ مفید ہے اور زیادہ ثقافتی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ تہذیب و ثقافت کے روایتی تصور کی تن دامنی عوام میں پائی جانے والی تہذیب و ثقافت کی رسوائی کا ایک بڑا سبب ہے۔ حقیقی تہذیب کا تقاضا یہ ہے کہ انسان خود کو زمان و مکان کے کسی خود ساختہ ٹکڑے سے منسوب کرنے کے بجائے اپنے تئیں آفاقی شہری خیال کرے۔ تب وہ انسانی معاشرے کو بہ حیثیت مجموعی سمجھ سکے گا اور دانشمندی سے ان مقاصد کا اندازہ لگا سکے گا جو معاشروں کو پیشِ نظر رکھنے چاہئیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ زمانہ حال کو

http://muftbooks.blogspot.com/

ماضی اور مستقبل کے حوالے سے جان سکے گا۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان لوگوں کے لئے حقیقی مذہب و ثقافت بہت اہم ہے جن کو قوت منتقل کی جانی ہو۔ ایسے لوگوں کے لئے اس کی اہمیت کم از کم اتنی ہے جتنی مفصل معلومات کی۔ انسانوں کو مفید بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ انہیں عقل مند بنایا جائے اور عقل و دانش کا ایک لازمی جزو جامع ذہن ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

ساتواں باب

تعلیم اور انبوہ

تعمیر کردار میں جو عوامل سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں ان میں سے ایک بچپن اور ایام شباب میں فرد پر گروہ یا انبوہ کا اثر ورسوخ ہے۔ شخصیت کی یکجہتی میں بہت سی ناکامیاں ان دو مختلف قسم کے گروہوں کے درمیان تصادم سے پیدا ہوتی ہے جن سے بچے کا تعلق ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض دیگر ناکامیاں انفرادی اور گروہی مزاج میں اختلافات سے پیدا ہوتی ہیں۔ تعلیم کے معاملے میں اس مسئلے پر خاص توجہ دینی چاہئے کہ گروہ کا اثر و رسوخ زیادہ نہ ہو اور یہ کہ اس کی فعالیت ضرر رساں ہونے کے بجائے مفید ہو۔

اکثر نوجوانوں پر دو قسم کے گروہ اثر انداز ہوا کرتے ہیں۔ ان کو ہم بالترتیب بڑا گروہ اور چھوٹا گروہ کا عنوان دے سکتے ہیں۔ بڑا گروہ صرف جواں سال لوگوں پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ اس پورے سماج پر مبنی ہوتا ہے جس سے بچے کا تعلق ہوتا ہے۔ اس کا زیادہ تر تعین بچے کے گھر سے ہوتا ہے سوائے ان صورتوں کے جب بچے کے گھر اور سکول میں کوئی خاص تضاد موجود ہو۔ مثال کے طور پر اس قسم کا تضاد امریکہ میں تارکین وطن کے بچوں میں دکھائی دیتا ہے۔ لڑکا یا لڑکی جو زمانہ سکول میں بسر کرتی ہے، اس دوران چھوٹا گروہ بڑے گروہ کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہوتا ہے۔ یہ چھوٹا گروہ سکول کے ساتھیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جب انسانوں کی کوئی جماعت ایک دوسرے کے قریب وقت گزارتی ہے تو اس میں گروہی احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ اس احساس کا اظہار کردار کی خاص قسم کی جبلی یکسانیت کی صورت میں نیز ایسے کسی فرد کی مخالفت کی صورت میں ہوتا ہے جو اگرچہ قریب رہتا ہو لیکن اسے گروپ میں شمار نہ کیا جاتا ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی بچہ سکول میں نیا نیا داخل ہوتا ہے تو کچھ عرصے کے لئے سکول کے پرانے طالب علم اسے شک وشبہ کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اب اگر اس بچے میں کوئی نرالی بات نہ ہو تو پھر جلد ہی سے

http://muftbooks.blogspot.com/

گروہ کے ایک اور رکن کی حیثیت سے قبول کرلیا جاتا ہے۔ وہ بھی دوسروں کی راہ پر چلنے لگتا ہے۔ ان کی طرح سوچنے اور ان ہی کی طرح محسوس کرنے لگتا ہے۔ لیکن اگر وہ دوسروں سے کسی اعتبار سے مختلف ہوتو پھر دو میں سے ایک بات واقع ہوسکتی ہے۔ اول یہ کہ وہ گروہ کا لیڈر بن سکتا ہے یا پھر وہ خوف وحراس کا نشانہ بنا رہتا ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ بعض غیر معمولی بچے بھی اپنی پسندیدہ طبیعت کے باعث گروہ میں ضم ہو جایا کرتے ہیں۔

رواجی لوگ اپنے سکول کے زمانے میں فوراً اور کم وبیش جبلی انداز میں اس شے کا احساس کر لیتے ہیں جو گروہ کا ایک رواجی رکن بننے کے لئے درکار ہوتی ہے اور جو بعد کی زندگی میں عمومی احترام حاصل کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اگر کلب کا کوئی ساتھی رکن کوئی ایسا کام کرتا ہے جو بالکل درست نہیں ہے، تو آدمی فوراً ہی اپنے سکول کے زمانے کے حافظے سے اس برتاؤ کو یاد کر لیتا ہے جو عجیب وغریب لڑکوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ پھر وہ اپنے طرزِ عمل کو بالغ ضابطہ اخلاق کے تقاضوں کے مطابق ڈھالتے ہوئے بنیادی طور پر اس برتاؤ کو برقرار ضرور رکھتا ہے۔ اس طرح وہ حقیقی طور پر موثر اخلاقی ضابطہ معرض وجود میں آتا ہے جس کا اطلاق انسانوں پر کیا جاتا ہے۔ کوئی شخص بد اخلاقی کا مرتکب ہوسکتا ہے۔ وہ غیر قانونی کام کرسکتا ہے۔ وہ سنگ دل یا ظالم ہوسکتا ہے یا کسی مناسب موقع پر گستاخ بھی ہوسکتا ہے لیکن اسے ایسا کوئی قدم نہ اٹھانا چاہئے جس کی وجہ سے جماعت اس کے ساتھ بے رخی سے پیش آئے۔ اس قسم کے اقدامات کونسے ہیں؟ اس کا دارومدار تو متعلقہ شخص کے ملک، اس کی عمر اور اس کے سماجی طریقے پر ہے۔ بہرطور ہر ملک میں، ہر عمر میں اور ہر سماجی طبقے میں اس قسم کے اقدامات ہوتے ضرور ہیں۔

تقریباً تمام عورتوں اور مردوں میں گروہ کا خوف بہت گہرا ہوا کرتا ہے اور سب سے پہلے یہ خوف سکول میں پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا اخلاقی تعلیم میں یہ مسئلہ بہت اہم بن جاتا ہے کہ سکولی گروہ جن اُمور کے لئے سزا دے وہ ایسے غیر پسندیدہ اُمور ہونے چاہئیں جن سے چھٹکارا پانا بچے کے اختیار میں ہو۔ تاہم یہ کام بے حد دشوار ہے۔ لڑکوں کے کسی گروہ کا فطری ضابطہ عام طور پر زیادہ سرفراز نہیں ہوتا اور جن اُمور کے لئے وہ عام طور پر سزا دیتے ہیں وہ سزا بھگتنے والوں کے بس میں نہیں ہوتے۔ مثلاً اگر کسی لڑکے کے چہرے پر

http://muftbooks.blogspot.com/

کوئی قدرتی داغ ہوتو عام طور پر سکول میں اسے طنز و مزاج کا نشانہ بنانے کی بجائے اس کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنا چاہئے۔ میرے خیال میں یہ رویہ ناگزیر نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ لڑکوں کو زیادہ مہربان رویہ اختیار کرنے کا درس دیا جا سکتا ہے لیکن یہ کام ہے مشکل اور سکولوں کے اساتذہ کرام جو زیادہ تر نام نہاد مردانگی کے گن گانے والے ہوتے ہیں، وہ اس کام کے لئے مشکل ہی سے آمادہ ہوں گے۔

انفرادی نہ سہی، لیکن سماجی نقطہ نظر سے ان لڑکوں کا معاملہ زیادہ ہی مشکل ہے جن کا بڑا گروہ سکول کے چھوٹے گروہ کا کسی نہ کسی اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ یہاں ہم ایسے یہودی بچوں کی مثال دے سکتے ہیں جو مسیحی اکثریت کے سکولوں میں پڑھتے ہیں۔ سب سے زیادہ لبرل معاشروں میں بھی اکثر یہودیوں کو لڑکپن کے ایام میں اپنے جداگانہ تشخص کے سبب توہین آمیز سلوک کا نشانہ بننا پڑتا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی ذلتوں کو وہ فراموش نہیں کرتے۔ یہ ان کے حافظے میں محفوظ رہتی ہیں اور زندگی اور سماج سے متعلق ان کے پورے نقطہ نظر پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ گھر کے ماحول میں کسی یہودی بچے کو یہ درس دیا جا سکتا ہے کہ اسے یہودی ہونے پر ناز کرنا چاہئے۔ اپنی عقل کے ذریعے وہ یہ بھی جان سکتا ہے کہ یہودی تہذیب اکثر مغربی اقوام کی تہذیب سے قدیم تر ہے اور یہ کہ تعداد کے حوالے سے دیکھائے تو یہودیوں کے حاصلات دوسری تمام اقوام کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ اس کے باوجود جب کوئی یہودی بچہ سکول میں دوسرے بچوں کو اپنا مذاق اڑاتے دیکھتا ہے تو اسے یہ بات یاد رکھنا دشوار دکھائی دیتا ہے کہ یہودی ہونا کوئی اچھی بات ہے۔ ہاں اگر وہ اسے یاد رکھتا بھی ہے تو سرکشی کے ساتھ یاد رکھتا ہے۔ یوں اس کے دل میں گھر کے معیاروں اور سکول کے معیاروں کے درمیان ایک تضاد پیدا ہو جاتا ہے جو شدید نفسیاتی تناؤ اور گہرے جبلی خوف کا سبب بنتا ہے۔ یہودی قوم پرستی کے علاوہ اس صورتِ حال کے دو مخصوص قسم کے ردِعمل ہیں۔ ان میں سے ایک انقلاب کی طرف لے جاتا ہے اور دوسرا موقع پرستی کی راہ تیار کرتا ہے۔ ہم ان دو متضاد ردِعملوں کی مثال کارل مارکس اور ڈزریلی کے حوالے سے دے سکتے ہیں۔ موجود نظام کے بارے میں مارکس کے یہاں جو شدید نفرت پائی جاتی ہے، وہ شاید اس کے غیر یہودی ہونے کی صورت میں موجود نہ ہوتی۔ خیر وہ اس قدر ذہین ضرور تھا کہ اس نے غیر یہودیوں کی بابت اپنی نفرت

http://muftbooks.blogspot.com/

کا براہِ راست اظہار نہیں کیا۔ اس نے اپنی نفرت کا رخ غیر یہودیوں سے سرمایہ داروں کی طرف موڑ دیا۔ اب چونکہ زیادہ تر سرمایہ دار تھے ہی قابلِ نفرت، اس لئے مارکس کو ان کے خلاف نفرت کا اظہار کرنے اور سماجی نظام میں ان کے مقام سے متعلق ایک خاص حد تک درست نظریہ بنانے میں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔

ڈزریلی نسل کے لحاظ سے یہودی لیکن مذہب کے اعتبار سے عیسائی تھی۔ اس نے صورت حال کا مقابلہ مارکس سے بالکل مختلف انداز میں کیا۔ اس نے امرا کی شان و شوکت اور بادشاہوں کی عظمت و دبدبے کو دل کی گہرائیوں سے سراہا۔ وہ پورے خلوص سے سمجھتا تھا کہ یہ چیزیں استحکام کی اساس ہیں۔ وہ بدامنی اور خوف و ہراس سے نجات دلاتی ہیں اور قتل عام سے محفوظ رکھتی ہیں۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ مخالف گروہ کے جس خوف نے مارکس کو انقلابی بنایا تھا، اسی خوف نے ڈزریلی میں حفاظت کی خواہش بیدار کر دی۔ تعجب انگیز مہارت کے ساتھ ڈزریلی نے خود کو پسندیدہ گروہ میں نہ صرف جذب کر لیا بلکہ اس گروہ میں اپنے لئے اعلیٰ مقام بھی بنایا۔ یہاں تک کہ وہ مغرور امرا کا لیڈر اور بادشاہ کا منظورِ نظر بن گیا۔ جب اس نے برطانوی پارلیمنٹ کے ایوان زیریں میں پہلی تقریر کی تو لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا تھا۔ اس موقع پر اس نے وہ جملہ کہا جو اس کی زندگی کے بنیادی نکتے کو آشکار کرتا ہے۔ ڈزریلی نے مذاق اُڑانے والوں سے کہا تھا ''وہ وقت بھی آئے گا جب تم لوگوں کو میری بات سننا ہی پڑے گی۔''

خاندانی امرا کا رویہ اس کے بالکل برعکس ہوا کرتا ہے۔ اس قسم کے رویئے کی مثال بڑے پٹ کے واقعہ میں ملتی ہے۔ اس نے پارلیمنٹ میں ایک بار اپنی تقریر ''شوگر، سر.....'' کے الفاظ سے شروع کی۔ اس پر ارکان ہنسنے لگے۔ پٹ نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور بلند تر آواز میں دہرایا ''شوگر، سر'' لوگ ایک بار پھر ہنسنے لگے۔ تیسری بار پٹ غصیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے گرجا: ''شوگر، سر.....'' اس بار کسی کو ہنسنے کی جرات نہ ہوئی۔

گروہ کے ہاتھوں بچے کو جس ندامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کی خفت مٹانے کی خواہش میں بہت سے بچے اچھے یا برے کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔ حرامی بچے اس

http://muftbooks.blogspot.com/

ضمن میں مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ شیکسپیئر کے مشہور ڈرامہ لیر کا کردار ایڈمنڈ اس طریقہ کار کی وضاحت کرتا ہے کہ کس طرح حرامی ہونے کے باعث اس میں عام لوگوں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ میں تو یہ کہنے کی جرات بھی کروں گا کہ اگر فاتح ولیم کو اپنے حرامی ہونے کا داغ مٹانے کی خواہش نہ ہوتی تو وہ ہرگز اس قدر شاندار کارنامے سرانجام نہ دیتا۔

اب تک ہم ایسے افراد پر عام قسم کے گروہوں کے اثرات پر غور کرتے چلے آئے ہیں جو اپنے کردار یا حالات کے حوالے سے غیر معمولی تھے۔ تاہم زیادہ شدید نوعیت اور زیادہ ظالمانہ قسم کے طفلانہ گروہ بھی ہوا کرتے ہیں۔ کرو پوٹکن بچپن میں ایسے سکول میں پڑھتا تھا جس میں زار روس کے منظور نظر لڑکے ہی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اپنے ایام سکول کے جن واقعات کا اس نے ذکر کیا ہے، وہ بہت دلچسپ ہیں۔ مثال کے طور پر اس نے لکھا ہے کہ ''.....لڑکوں کا ایک جتھا جو جی میں آئے کرتا تھا۔ گزشتہ جاڑے میں ان کا ایک محبوب مشغلہ نہ تھا کہ وہ بعض بے وقوفوں کو رات کے وقت ایک کمرے میں رات کے لباس میں جمع کر لیتے اور پھر جس طرح سرکس میں گھوڑے دوڑائے جاتے ہیں، اس طرح انہیں کمرے میں چاروں طرف دوڑاتے۔ پھر ہاتھوں میں ربڑ کا مضبوط کوڑا لے کر لڑکوں کو بے رحمی سے پیٹا جاتا۔ یہ ''تماشہ'' حسب معمولی مشرقی انداز میں نہایت نفرت انگیز طریقے سے انجام کو پہنچتا۔ اخلاقیات کے جو تصورات اس زمانے میں رائج تھے اور تماشہ ختم ہونے کے بعد کے واقعات کے بارے میں سکول میں جو لغو چرچے ہوتے رہتے تھے، ان کا ذکر نہ کرنا ہی بہتر ہے۔''

نمایاں شخصیات کے کردار پر پڑنے والے سکولی گروہ کے اثرات کے بارے میں مبالغہ آرائی دشوار ہے۔ آیئے ہم نپولین کی مثال ہی لے لیں۔ ایام شباب میں نپولین برئین کے امرا کے ملٹری کالج میں پڑھتا تھا۔ اس کالج کے دوسرے تمام طلبہ نپولین کے مقابلے میں زیادہ امیر اور اعلیٰ تر گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ نپولین کو اس کالج میں داخلہ فرانس کی طرف سے کورسیکا کو دی جانے والی رعایت کے سبب ملا تھا اس رعایت کے ذریعے کورسیکا کے چند نوجوانوں کو برئین میں مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ نپولین بہت سے افراد پر مشتمل کنبے سے تعلق رکھتا تھا اور اس کی ماں غریب تھی۔ لیکن جب نپولین شہنشاہ بن

http://muftbooks.blogspot.com/

گیا تو پھر آسانی سے یہ بات بھی دریافت کر لی گئی کہ اس کا تعلق گبلین کے ایک قدیم خاندان ہے۔ طالبِ علمی کے زمانے میں یہ بات معلوم نہ تھی۔ تب اس کے کپڑے سادہ اور پٹھے پرانے ہوا کرتے تھے، جبکہ دوسرے طالب علم شاندار لباس زیب تن کئے ہوتے تھے۔ وہ نپولین سے حقارت سے پیش آتے۔ جب فرانس میں انقلاب برپا ہوا تو نپولین نے اس سے ہمدردی ظاہر کی۔ ہم شبہ کر سکتے ہیں کہ اس کی اس ہمدردی میں اس ذلت و خواری کا بھی حصہ تھا جس کا سامنا نپولین کو اپنے ساتھی طالب علموں کی طرف سے کرنا پڑتا تھا۔ البتہ جب وہ شہنشاہ بن گیا تو ایک شدید تر اور الف لیلوی انداز کا انتقام لینے کے قابل بھی ہو گیا۔ چنانچہ جو اس کی توہین کیا کرتے تھے اب انہیں مجبور کیا جا سکتا تھا کہ وہ اس کے سامنے جھکنے کا اعزاز حاصل کرنے کی التجا کریں۔ کیا اس میں کسی شبے کی گنجائش ہے کہ اپنے اقتدار کے آخری زمانے میں نپولین جس غرور و تمکنت سے کام لینے لگا تھا، اس کے پیچھے ان ذلتوں کا ہاتھ تھا جو اس نے بچپن میں برداشت کی تھیں۔ اس کی ماں جس نے اس قسم کی ذلتیں برداشت نہ کی تھیں، وہ نپولین کے عروج کے دنوں کو بے تعلقی سے دیکھتی تھی اور اس کی خواہشوں کے برخلاف برے دنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ جمع کرتی رہتی تھی۔

چند بڑے لوگ ایسے بھی گزرے ہیں کہ جن کو گروہی دباؤ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ان میں سے زیادہ تر بادشاہ تھے۔ ان میں سے ایک نمایاں بادشاہ سکندر اعظم ہے جو زندگی کے کسی مرحلے میں بھی اپنے ہم پلہ کے گروہ کے درمیان نہیں رہا تھا۔ شاید ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی عظمت میں اور ساتھ ہی ساتھ اس کی کوتاہیوں میں اس حقیقت نے جزوی کردار ضرور ادا کیا ہے۔ سکول میں نئے داخل ہونے والے بچے میں جو انکساری پیدا ہو جاتی ہے، وہ کبھی شان و شوکت کے خواب میں دیکھنے میں سکندر اعظم کے لئے رکاوٹ نہ بن سکی تھی۔ وہ اپنے آپ کو فاتح کے روپ میں دیکھتا تھا، لہٰذا پوری دنیا کو فتح کرنا اسے بالکل فطری بات دکھائی دیتی تھی۔ اسی طرح وہ اپنے آپ کو تمام معاصرین سے عظیم تر خیال کرتا تھا۔ لہٰذا اپنے تئیں دیوتا سمجھنا اسے بالکل فطری معلوم ہوتا تھا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ میل ملاپ میں وہ ان کے حقوق کا کوئی اشارہ نہ دیتا تھا۔ پرمینیو اور کلے ٹس کے قتل کو الگ تھلگ کر کرے دیکھا جائے تو وہ سکندرِ اعظم کے جابر ہونے کا تاثر دیتے ہیں۔

http://muftbooks.blogspot.com/

البتہ نفسیاتی طور پر ان کی توجیہ کی جاسکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان دونوں کا قتل اس شخص کی بے صبری کا نتیجہ تھے جو خود کبھی بھی گروہ کے دباؤ کا شکار نہ ہوا تھا۔

مندرجہ بالا مثالیں اس امر کی وضاحت کے لئے پیش کی گئی ہیں کہ کردار کی تشکیل میں سکولی گروہ بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ اثر خاص طور پر اس وقت اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے جب اس کا تصادم غیر معمولی صلاحیت کے حامل بچے کی کسی انفرادی یا سماجی خصوصیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ کوئی نیا سکول قائم کرنے کے خواہش مند شخص کو کسی اور واحد معاملے سے زیادہ اس گروہ کی نوعیت پر غور کرنا چاہئے جس کو وہ تخلیق کرے گا۔ اگر وہ خود مہربان اور بردبار ہے لیکن سکولی گروہ کو بے رحم اور تنگ نظر ہونے کا موقع دیتا ہے تو پھر اس کی تمام خوبیوں کے باوجود اس کی نگرانی میں آنے والے لڑکوں کو تکلیف دہ ماحول کے تجربے سے گزرنا پڑے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ عدم مداخلت کے نظریے کے تحت بعض جدید سکولوں میں ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے ہیں کہ جن میں اس قسم کی بات آسانی سے وقوع پذیر ہوسکتی ہے۔

بالغ لوگ اگر بچوں کے معاملات میں بالکل ہی دخل نہ دیں تو امکان یہ ہوتا ہے کہ بڑے بچے چھوٹے بچوں پر اپنی بالادستی قائم کرلیں گے۔ یوں بچوں کی آزادی مجروح ہوگی اور جسمانی طور پر زیادہ مضبوط بچوں کا گروہ ہی آزادی سے ہمکنار ہو سکے گا۔ تاہم براہِ راست انضباطی اقدامات کے ذریعے چھوٹی عمر کے بچوں پر بڑی عمر کے بچوں کی بالادستی کو روکنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ مثلاً اگر بالغ افراد بڑی عمر کے بچوں کے ساتھ برتاؤ میں قوت سے کام لیں تو یہ بچے بھی ان کی نقل کریں گے اور اپنے سے چھوٹے بچوں کے ساتھ سختی سے پیش آئیں گے۔ اصل مقصد یہ ہونا چاہئے کہ گروہ کا دباؤ ممکنہ حد تک کم ہو اور جسمانی قوت کی بالادستی اس حد تک کم ہو جس حد تک وہ بچوں کی فطرت کے مطابق ہو۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے اگرچہ یہ بات اچھی ہے کہ وہ اپنے ماصرین کے ساتھ سماجی برتاؤ کا سبق سیکھیں لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے کہ وہ بہت زیادہ گروہی دباؤ کا نشانہ بنیں۔ گروہی دباؤ کے بارے میں رائے دو حوالوں سے قائم کی جاسکتی ہے۔ اول اس کی شدت اور دوم اس کی سمت۔ اگر یہ دباؤ بہت زیادہ شدید ہو تو وہ ایسے بالغ پیدا کرتا ہے جو عموماً بزدل اور تقلید پرست ہوتے ہیں۔

http://muftbooks.blogspot.com/

یہ صورتِ حال افسوسناک ہوگی، چاہے گروہ کو سرگرم کار کرنے والے اخلاقی معیار کتنے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں۔ ''ٹوم براؤن کے ایام سکول'' نامی کتاب میں ایک ایسے لڑکے کا ذکر ملتا ہے جسے عبادت کرنے پر پیٹا جاتا تھا۔ اس کتاب کا بڑا اثر ہوا اور اپنے معاصرین میں سے میں ایک ایسے صاحب کو جانتا ہوں جس کو عبادت نہ کرنے کی وجہ سے سکول میں پیٹا گیا تھا۔ میں افسوس سے کہتا ہوں کہ اس قسم کے تجربے سے گزرنے کے بعد وہ صاحب زندگی بھر ملحد رہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ گروہی جبر کی یہ بہت زیادہ نیکوکارانہ صورت بھی، جب اس میں بہت زیادہ شدت پیدا ہو جائے، تو وہ غیر پسندیدہ بن جاتی ہے۔

بات یہ ہے کہ بہت زیادہ گروہی دباؤ انفرادیت کی نشوونما میں اور ساتھ ہی ان تمام دلچسپیوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے جو اوسط درجے کے بچوں میں عام طور پر نہیں پائی جاتیں۔ اس قسم کی دلچسپیوں میں سائنس، آرٹ، ادب، تاریخ اور وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو تہذیب کی تشکیل کرتی ہیں۔ خیر اس حقیقت سے کہ گروہ کے اندر مسابقت کے اچھے پہلو بھی ہیں، اس سے جسمانی شجاعت کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جبکہ ہر قسم کی منافقانہ کمینگیوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ لہٰذا اپنی حدود کے اندر اس کے فوائد بھی ہیں۔

گروہ کے مقاصد مجموعی طور پر اچھے ہوں تو اس قسم کے فوائد اور بھی بڑھ جاتے ہیں۔ غیر معمولی قابلیت کے حامل لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے خصوصی سکولوں کے خصوصی فائدوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس قسم کے سکولوں میں گروہ عام سکولوں کے مقابلے میں زیادہ روشن خیال ہوتا ہے اور تہذیب افزا مشاغل کی وہ کم مخالفت کرتا ہے۔ بہرطور جہاں تک مکمل طور پر عام قسم کے لڑکوں اور لڑکیوں کا معاملہ ہے، وہاں بھی رواداری، برداشت اور رحمدلی کو ایک خاص حد تک پیدا کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ بالغوں کی مناسب مثال سامنے ہو۔ اسی طرح اجتماعی کاموں، مثلاً کھیلوں میں دلچسپی بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ جن میں گروہی جبلت دبانے کے بجائے تعاون کرنے کی طرف مائل ہوتی ہے۔

بعض نمایاں طور پر اہم شخصیتوں کے لئے گہرے طور پر اہم محسوس ہونے والے کسی سبب کی بنا پر گروہ کے مقابلے میں ڈٹ جانے میں کوئی تعلیمی قدر مضمر ہوتی ہے۔ اس قسم کے کردار ارادے کو مضبوط کرتا ہے اور انسان کو خود انحصاری کا درس دیتا ہے۔ اس کے

http://muftbooks.blogspot.com/

حوالے سے اگر فرد کو بہت زیادہ مصائب برداشت نہ کرنے پڑیں تو پھر یہ اس کے حق میں مفید ثابت ہوتی ہے لیکن اگر گروہ ایک خاص حد سے زیادہ اسے رنج دے تو وہ یا تو ہار مان لیتا ہے اور اس شے کو کھو دیتا ہے جو اس کے کردار میں سب سے زیادہ شاندار تھی یا پھر تخریبی غصے سے بھر جاتا ہے جو، جیسا کہ نپولین کے معاملے میں ہوا، دنیا کو شدید نقصان پہنچا سکتا ہے۔

جہاں تک سکول سے باہر کے بڑے گروہ کا تعلق ہے، وہ والدین جن کے خیالات دوسرے لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ ایک ایسی الجھن میں پھنس جاتے ہیں جس کو حل کرنا ان میں سے اکثر کو بہت مشکل محسوس ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے بچوں کو ایسے سکول میں داخل کرواتے ہیں جس میں انحرافی خیالات کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے یا جس میں غیر معمولی حد تک آزادی مہیا کی جاتی ہے تو انہیں یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ جب ان کے بچے سکول سے فارغ ہونے کے بعد باہر کی دنیا میں قدم رکھیں گے تو پھر وہ اپنے آپ کو آسانی سے حالات کے مطابق نہ ڈھال سکیں گے۔ جن لوگوں کو جنس کے بارے میں سوچنے اور بولنے کی آزادی میسر رہی ہو وہ اپنے آپ کو بعد ازاں معمول کی پابندیوں اور ممنوعات کے روبرو بے بس پاتے ہیں۔ جنہیں حب الوطنی کی تعلیم نہیں دی گئی وہ ہمارے قوم پرستی کے جذبے سے بھرپور دنیا میں اپنے لئے جگہ بنانے میں دشواری محسوس کریں گے۔ اسی طرح جن کو حاکمیت کے احترام کا درس نہیں دیا گیا وہ اپنی تنقیدات کی آزادی کے حوالے سے خود کو مشکل میں پائیں گے۔ مختصر یہ کہ جو لوگ آزادی کے عادی رہے ہوں وہ غلامی کی زنجیروں کو ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ تکلیف دہ محسوس کریں گے جو جنم جنم کے غلام ہوں۔ کم از کم استدلال کی یہ وہ قسم ہے جو میں نے ان آزاد خیال والدین سے اکثر سنی ہے جو اپنے بچوں کو غیر آزادانہ تعلیم دلانے کے حق میں ہوا کرتے ہیں۔

میرے خیال میں اس دلیل کے دو جواب ہیں۔ ان میں سے ایک نسبتاً سطحی ہے جبکہ دوسرا بنیادی نوعیت کا ہے۔ ان میں سے پہلا جواب اس امر کی نشاندھی پر مشتمل ہے کہ کردار کی ظاہری ہم آہنگی ایک ایسی شے ہے جس کو نوجوان آسانی سے سیکھ لیتے ہیں اور یہ کہ یہ ہم آہنگی تعلیم کے ایسے روایتی نظامات میں دنیا میں ہر جگہ سکھائی جاتی ہے جہاں والیدن اور اساتذہ کے روبرو بچوں کا کردار اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے جس طرح کہ وہ آپس میں پیش آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ عنفوان شباب میں بھی اس ہم آہنگی کو اسی قدر

http://muftbooks.blogspot.com/

آسانی سے سیکھا جا سکتا ہے جتنا کہ زندگی کے زیادہ ابتدائی مراحل پر ہوتا ہے۔ کسی حد تک تو یہ محض اچھے آداب سیکھنے کا معاملہ ہے۔ یہ بدتہذیبی ہوگی کہ کسی شخص کے سامنے اس کے نبی کے خلاف بات کی جائے یا کسی جج کے روبرو تعزیری قوانین کی برائی کی جائے۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کسی موضوع پر اپنی رائے کا کھلم کھلا اظہار ہمارا سماجی فرض ہو لیکن ہمارا یہ فرض مشکل ہی سے ہوسکتا ہے کہ اپنی ان آرا کا اظہار نجی طور پر ایسی محفلوں میں کریں جن سے دوسروں میں صرف ناراضگی اور دکھ کا احساس ہی پیدا ہو۔

میں نہیں سمجھتا کہ آزادانہ تعلیم کسی لڑکے یا لڑکی کو اچھے آداب اور خوش اخلاقی کے نااہل بنا سکتی ہے۔ اس طرح وہ اس ظاہری شائستگی کی راہ میں رکاوٹ بھی نہیں بنتی جو کہ رسمی زندگی کا تقاضا ہے۔ اسی طرح میں یہ بات بھی تسلیم نہیں کرتا کہ آزاد تعلیم کے بعد سماجی ہم آہنگی پیدا کرنے میں جو تکلیف پیش آتی ہے وہ کم وبیش ان پیچیدگیوں سے پیدا ہونے والی تکالیف جتنی شدید ہوتی ہے جو روایتی تعلیم کے عمل کے دوران جڑ پکڑ لیتی ہیں۔

دوسرا جواب زیادہ گہرا ہے۔ ہماری دنیا میں شدید قسم کی برائیاں موجود ہیں جو اس وقت دور ہوں گی جب انسان انہیں دور کرنا چاہیں گے۔ یہ بجا ہے کہ جو لوگ ان برائیوں سے آگاہ ہیں اور ان کے خلاف برسرپیکار بھی ہیں وہ روزمرہ کی زندگی میں ان لوگوں کے مقابلے میں کم ہی خوشیاں سمیٹتے ہیں جو حالات کو جوں کا توں قبول کرتے ہیں تاہم روزمرہ کی خوشیوں اور مسرتوں کی جگہ وہ ایک ایسی شے حاصل کر لیتے ہیں جس کو میں اپنے لئے اور اپنے بچوں کے لئے زیادہ قابل قدر خیال کرتا ہوں۔ انہیں یہ احساس ہوگا کہ دنیا کے دکھ درد کو کم کرنے کے لئے انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو ان کے بس میں تھا۔ بےشعور تقلید پرستوں کے مقابلے میں ان کے پاس اقدار کا زیادہ منصفانہ معیار ہوگا۔ وہ اس امر سے باخبر ہوں گے کہ وہ ان لوگوں کی صف میں شامل ہیں جو نسل انسانی کو جمود و یاس کی گہرائیوں میں ڈوب جانے سے بچاتے ہیں۔ یہ چیز کاہلی آمیز قناعت سے بہتر ہے۔ اگر آزاد تعلیم اس شے کو فروغ دے سکتی ہے تو پھر والدین کو ان عارضی تکالیف سے نہیں گھبرانا چاہئے جو اس قسم کی تعلیم کے حوالے سے ان کے بچوں کو پیش آسکتی ہیں۔

❁❁❁

http://muftbooks.blogspot.com/

آٹھواں باب

تعلیم اور مذہب

مذہب ایک پیچیدہ معاملہ ہے۔ اس کے انفرادی اور سماجی دو پہلو ہیں۔ تاریخی زمانوں کے آغاز ہی میں مذہب پرانا ہو چکا تھا۔ تاریخ میں ہوا یہ ہے کہ جوں جوں مذہب پیچھے ہٹا ہے، تو توں تہذیب کے قدم آگے بڑھے ہیں۔ بالکل ابتدائی مذاہب، جن کے بارے میں ہمیں علم ہے، وہ انفرادی ہونے کے بجائے اجتماعی تھے۔ ان زمانوں میں ایسے طاقتور دیوی دیوتا موجود تھے جو کسی ایک فرد کے نیک و بد فعل کی جزا و سزا پورے قبیلے کو دیتے تھے۔ ان دیوتاؤں کے اچھے یا برے کاموں سے متعلق احساسات کا اندازہ استقرائی طریقے سے لگایا جاتا تھا اور پھر کاہن انہیں اپنی روایت میں شامل کر لیتے تھے۔ زلزلہ یا کسی وبا کے سبب اگر کسی علاقے کے لوگ برباد ہو جاتے تو دانا لوگ یہ جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ مصیبت کا شکار بننے والوں کی مخصوص عادات کیا تھیں اور پھر وہ اس نتیجے پر پہنچتے تھے کہ آئندہ ان عادات سے گریز کرنا ہوگا۔

خیر، یہ نقطہ نظر ابھی تک پوری طرح ملیا میٹ نہیں ہوا۔ میں چرچ آف انگلینڈ کے ایک پادری کو جانتا ہوں جس کا کہنا ہے کہ جرمنوں کو دوسری جنگ عظیم میں اس لئے شکست سے دوچار ہونا پڑا کہ تنقید اعلیٰ کے رسیا تھے۔ ان پادری صاحب کے نزدیک خالق کائنات کو عبرانی صحیفوں کی تفسیر پسند نہیں۔

جیسا کہ مذہب کے حامی ہمیں جتلانے کے عادی ہیں، مذہب سماجی ذمہ داری کے احساس کا سرچشمہ ہے۔ جب کوئی شخص دیوتاؤں کی مرضی کے خلاف کام کرتا تھا، تو وہ نہ صرف اس سرکش کو بلکہ پورے قبیلے کو سزا دیا کرتے تھے۔ اس لئے فرد کا معاملہ سب کا

http://muftbooks.blogspot.com/

معاملہ بن جاتا تھا، کیونکہ ایک شخص کا گناہ سب کے لئے مصائب کا سبب بنتا تھا۔ یہ نقطہ نظر اب بھی فوجداری قانون پر غالب ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر بعض جنسی بداعتدالیاں ایسی ہیں کہ ان کے لئے لوگوں کو قید و بدن کی سزا بھگتنا پڑتی ہے۔ حالانکہ عقلی طور پر دیکھا جائے تو ان کے جنسی معاملے کا تعلق صرف ان کی ذات سے ہوتا ہے۔ اس سزا کا جواز تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو ہمیں وہ پرانے مذہبی نقطہ نظر ہی میں ملے گا۔

عجیب بات یہ ہے کہ دیوتاؤں کو جن اُمور پر اعتراض ہوتا تھا، وہ اس قسم کے ہیں کہ اگر وہ دیوتاؤں کو برافروختہ نہ کرتے تو شاید ہی کسی کو اس سے کوئی تکلیف پہنچتی۔ مثلاً دیوتا کسی انسان کے سور کھانے، گائے کا گوشت کھانے اور مردہ بیوی کی بہن سے شادی کرنے پر اعتراض کرتے ہیں۔ حضرت داؤد کے زمانے کا قصہ یہ ہے کہ خدا کو انسانوں کی گنتی کرنے کی بات پسند نہ آئی۔ چنانچہ اس نے وبائیں نازل کر کے اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو ہلاک کر دیا کہ حضرت داؤد کے جمع کردہ اعداد شمار دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ایزتیک لوگوں کے دیوتاؤں کی عادت یہ تھی کہ وہ اپنے ماننے والوں پر کوئی مہربانی کرنے سے پہلے انسانی قربانی اور مردم خواری پر اصرار کرتے تھے۔ خیر، اس کے باوجود کہ مذہب سے پیدا ہونے والے اخلاقی ضابطے عجیب و غریب رہے ہیں، ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہوگا کہ مذہب نے ہی ان ضابطوں کی تشکیل کی تھی۔ اب اگر کسی اخلاقیات کا ہونا نہ ہونے سے بہتر ہے، تو مذہب کی نیکی کی قوت قرار دیا جا سکتا ہے۔

مذہب کی ابتدا اگرچہ قبائلی معاملہ کے طور پر ہوئی تھی لیکن جلد ہی اس نے ایک خالص انفرادی پہلو کو بھی فروغ دیا۔ دنیائے قدیم میں چھٹی صدی قبل مسیح کے لگ بھگ ایک دوسرے سے الگ تھلگ ایسی تحریکیں شروع ہوئیں جنہوں نے اپنے تعلق انفرادی روح اور نجات سے بنایا تھا۔ چین کے تاؤ مت، ہندوستان کے بدھ مت، یونان کے اورفک مت اور عبرانی پیغمبروں کے یہاں ہمیں یہی خصوصیت دکھائی دیتی ہے۔ ان تمام مذہبی تحریکوں کا سرچشمہ یہ ادراک تھا کہ فطری زندگی دکھ درد سے بھرپور ہے۔ یہ تحریکیں ایسے طرزِ حیات کی جستجو سے پیدا ہوئی تھیں جو انسان کو بدبختی سے نجات کے قابل بنا سکے یا کم از کم اسے برداشت کرنے کے قابل بنا سکے۔

ان تحریکوں کے کچھ عرصہ بعد پارمینڈیز نامی یونانی فلسفی نے وقت کے غیر حقیقی

http://muftbooks.blogspot.com/

ہونے اور وحدت اشیاء سے متعلق اپنا فلسفہ پیش کر کے مذہبی فلسفے کی عظیم روایت کی داغ بیل ڈالی۔ اس روایت کے علمبرداروں میں افلاطون، پلوٹائنس، قرونِ وسطیٰ کے مذہبی فلاسفر، سپنوزا، ہیگل اور برگساں کے علاوہ تمام متصوف فلسفی شامل ہیں۔ انبیائے اسرائیل نے ایسے مذہب کو فروغ دیا تھا جو مابعد الطیعات سے زیادہ نیکی سے تعلق رکھتا تھا۔ عیسائیت کے پروٹسٹنٹ فرقے پر یہی عناصر حاوی ہوئے۔ عیسائیت کی تمام صورتوں میں اخلاقی اور مابعد الطیعاتی دونوں عناصر پائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیت یہودیت اور یونانیت کے ایک گہرے امتزاج سے پیدا ہوئی تھی۔ تاہم بعد ازاں جب عیسائیت مغرب کی طرف پیش رفت کرنے لگی تو مجموعی طور پر مابعد الطیعاتی عنصر کم اور اخلاقی عنصر بڑھتا چلا گیا۔ اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ ایران کے علاوہ، اس میں مابعد الطیعاتی عنصر بہت ہی کم ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان میں پیدا ہونے والے مذاہب زیادہ تر مابعد الطیعاتی رہے ہیں۔

انفرادی مذہب کی ابتدا ہی سے مذہبی زندگی میں نجی اور ادارہ جاتی عناصر ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہے ہیں۔ ادارہ جاتی عناصر عام طور پر سیاسی اعتبار سے مضبوط تر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں مذہبی رہنماؤں، نذر نذرانے، روایات حکومت اور قانون کی تائید حاصل رہی ہے۔ شخصی مذہب ایک نجی معاملہ ہوتا ہے۔ معاشرے کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف ادارہ جاتی مذہب بہت زیادہ سیاسی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ جہاں کہیں اس قسم کا مذہب موجود ہو وہاں جائیداد اس سے منسلک ہوتی ہے۔ مزید برآں اس معاشرے میں کوئی شخص اس کے عقائد کا پرچار کر کے روزی کما سکتا ہے۔ یعنی اس کی تبلیغ ایک پیشہ بن جاتی ہے جب کہ اس کی مخالفت کر کے کوئی شخص روزی نہیں کما سکتا یا کم از کم آسانی سے نہیں کما سکتا۔

تعلیم اصل میں ادارہ جاتی مذہب ہی سے متاثر ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے مذہب کو پرانے اداروں پر تسلط حاصل ہوتا ہے اور کئی ملکوں میں تو اسے ریاست پر بھی بالادستی حاصل ہوتی ہے۔ آج کل کے زمانے میں مغربی یورپ کے اکثر ملکوں میں مذہب کو خوش حال طبقے کی تعلیم پر غلبہ حاصل ہے۔ غریب طبقوں کی تعلیم پر اس کا اثر ورسوخ کم ہے۔ یہ زیادہ تر سیاسی اتفاق کا نتیجہ ہے۔ اگر کسی ملک میں کوئی ایک مذہب ریاست پر تسلط

http://muftbooks.blogspot.com/

حاصل کرنے کی حیثیت میں نہ ہوتو وہاں سرکاری سکول کسی خاص فرقے کے عقائد کی تعلیم نہیں دے سکتے۔ نجی سکولوں کا معاملہ البتہ مختلف ہے۔ وہاں والدین فیس ادا کرتے ہیں اور یہ سکول وہی کچھ پڑھاتے ہیں جس کو والدین مناسب خیال کرتے ہیں۔

برطانیہ اور فرانس میں زیادہ تر اسی وجہ سے امیر لوگ غریب شہری لوگوں کے مقابلے میں زیادہ مذہبی ہیں۔ یہاں میں اس امر کی وضاحت کردوں کہ میں نے ''مذہبی'' کا لفظ سیاسی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ امیر لوگ پاکباز ہوتے ہیں یا یہ کہ وہ مذہبی عقائد کو فکری اعتبار سے تسلیم کرتے ہیں۔ مطلب محض یہ ہے کہ امیر لوگ مذہب کی حمایت کرتے ہیں۔ قانونی اُمور میں اس کی تائید کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے بچے ایسے لوگوں کی نگرانی میں رہیں جو مذہبی تعلیمات کے قائل ہوں۔ اصل میں یہی وجہ ہے کہ مذہب کو ابھی تک اہمیت حاصل ہے۔

عام آزاد خیال لوگوں میں اکثر یہ رائے پائی جاتی ہے کہ اب مذہب کو سماجی زندگی میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں رہی۔ میرے خیال میں یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔ یہاں ہم شادی اور طلاق کے قانون کی مثال پیش کر سکتے ہیں۔ یہ قانون اگرچہ بالکل ویاس نہیں جیسا کہ مذہبی لوگ چاہتے ہیں۔ تاہم اس میں بے ہودگی اور جبر کے ایسے عناصر موجود ہیں (مثلاً دیوانگی کی صورت میں بھی طلاق کی اجازت نہ دینا) جو مذہب کے اثر و رسوخ کے بغیر ایک ہفتہ بھی قائم نہ رہ سکتے تھے۔ مذہب کے کھلے مخالفین کو مذہب کے حامیوں کے مقابلے میں کوئی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ عملی طور پر بہت سی اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے ملحدین پر بند ہیں۔ آزاد خیال لوگوں کو کامیابی حاصل کرنے کے لئے عقیدہ پرستوں کی نسبت زیادہ قابلیت درکار ہوتی ہے۔

فی زمانہ دوسرے شعبوں کے مقابلے میں تعلیم کے میدان میں ادارہ جاتی مذہب کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ انگلستان میں تمام پبلک سکول اور کم وبیش تمام ابتدائی سکول انگلستانی یا رومن کیتھولک چرچ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سکولوں میں اپنے بچے بھیجنے والے آزاد خیال والدین بسا اوقات یہ کہتے ہیں کہ اثر لوگ ان سکولوں کی مذہبی تعلیم کے خلاف ردِعمل رکھتے ہیں۔ لہٰذا نوجوانوں کو مذہبی چھوٹ کی تعلیم دینا مناسب ہی ہے تاکہ وہ اس کے جھوٹ سے آگاہ ہوکر سچ کی طرف راغب ہوسکیں۔ یہ دلیل بزدلانہ روایت کے خلاف

http://muftbooks.blogspot.com/

محض ایک بہانہ ہے۔ اس دلیل کو ایک لمحے کے سوچ بچار کے بعد اعداد و شمار کے حوالے سے غلط بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ بالغوں کی غالب اکثریت زندگی بھر ان عقیدوں کو قبول کئے رہتی ہے جن کی تعلیم سکول میں دی جاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قومیں صدیوں سے پروٹسٹنٹ، کیتھولک یا مسلمان وغیرہ چلی آ رہی ہیں۔ اب اگر ردِعمل کا نظریہ درست ہوتا تو ہر نسل کے بعد ان قوموں کا مذہب بھی تبدیل ہو جاتا۔ اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم دینگے والے مدرسوں میں داخل کروانے والا کوئی شخص جب یہ دلیل دیتا ہے تو اس کے اپنے طرزِ عمل ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس نے کس قدر کم ردِعمل ظاہر کیا ہے۔ آپ اگر نجی طور پر یقین رکھتے ہیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں، لیکن کھلم کھلا اس رائے کو ظاہر کرنے سے گریزاں ہیں اور اس بات کو جائز سمجھتے ہیں کہ قومی سرمایہ آپ کے اور دوسروں کے بچوں کو یہ درس دینے پر صرف کیا جائے کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں تو پھر سماجی حوالے سے آپ کی موثر رائے یہی ہے کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف آپ کا نجی یقین غیر اہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ خود مذہبی نہیں، لیکن مذہبی تعلیم کو پسندیدہ خیال کرتے ہیں، انہوں نے درحقیقت خود اپنی مذہبی تعلیم و تربیت کے خلاف کیس موثر پیرائے میں ردِعمل ظاہر نہیں کیا، چاہے وہ بظاہر ہر مذہب کے خلاف شدید احتجاج کرتے رہتے ہوں۔

کئی لوگ ایسے ہیں کہ وہ مذہبی عقائد کی عقلی طور پر تائید نہیں کرتے۔ تاہم یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب بے ضرر بلکہ شاید مفید چیز ہے۔ اس معاملے میں میں نام نہاد لبرل دانش وروں کے مقابلے میں عقیدہ پرستوں سے متفق ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ سوالات بہت اہم ہیں کہ آیا خدا وجود رکھتا ہے اور یہ کہ کیا موت کے بعد بھی ہم برقرار رہیں گے۔ میں ان سوالات پر سنجیدہ غور و فکر کو ضروری سمجھتا ہوں۔ میں سیاستدانوں کے اس نظریئے کو قبول نہیں کر سکتا کہ اگر خدا نہیں تو بھی اچھی بات یہ ہے کہ اکثر لوگ اس میں ایمان قائم رکھیں کیونکہ اس عقیدے سے نیک چال چلن کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ بچوں کے معاملے میں اکثر آزاد خیال دانشور یہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ آپ اپنے بچوں کو مذہب کا درس دیئے بغیر کس طرح اچھا بنا سکتے ہیں؟

ایسے دانشوروں کو میرا جواب یہ ہے کہ اگر آپ اہم ترین موضوع پر جان بوجھ

http://muftbooks.blogspot.com/

کر مسلسل جھوٹ بولتے جائیں تو پھر آپ ان کو نیک بننے کا درس کس طرح دے سکتے ہیں؟ سوال یہ بھی ہے کہ اگر کوئی طرزِ عمل واقعی اچھا ہے تو اس کے لئے محرک کے طور پر جھوٹے عقیدوں کی ضرورت کیوں ہے؟ جس طرز عمل کو آپ اچھا خیال کرتے ہیں، اس کے لئے اگر ٹھوس دلائل موجود نہیں تو صاف طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ اچھائی سے متعلق آپ کے تصور میں کوئی خرابی موجود ہے۔ بات یہ بھی ہے کہ مذہب کے بجائے والدین کی حاکمیت بچوں کے کردار پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مذہب محض یہ کرتا ہے کہ بچوں کو چند ایسے جذبات مہیا کر دیتا ہے جو عمل سے قریبی طور پر منضبط نہیں ہوتے اور زیادہ پسندیدہ بھی نہیں ہوتے۔ یہ درست ہے کہ بالواسطہ طور پر یہ جذبات کردار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ البتہ یہ اثرات ہرگز ویسے نہیں ہوتے جیسے مذہبی معلمین خواہش کرتے ہیں۔ خیر، یہ ایسا موضوع ہے جس پر ہم آگے چل کر دوبارہ گفتگو کریں گے۔

تعلیم کے برے اثرات کا جزوی طور پر دارومدار ان خاص نظریات پر ہے جن کی تعلیم دی جاتی ہے اور کسی حد تک اس اصرار پر کہ بہت سے مشکوک عقائد کا درست ہونا معلوم ہو چکا ہے۔ ان عقیدوں کا درست یا غلط ہونا ناقابل دریافت ہو سکتا ہے لیکن نوجوانوں کو ان کے سچا ہونے کی تلقین کرتے ہوئے مذہبی استاد اصل میں جھوٹ سے کام لے رہے ہوتے ہیں۔ موت کے بعد کی زندگی کا مسئلہ ہی لیجئے۔ اس مسئلہ پر دانا لوگ اپنی لاعلمی کا اقرار کرتے ہیں۔ اس موضوع پر شہادت ناکافی ہے لہٰذا فیصلے کو ملتوی رکھنا ہی دانش مندی کا تقاضا ہے لیکن مذہب اس قسم کی زندگی کے حق میں فیصلہ دیتا ہے اور مذہب کے زیرِ اثر تعلیم پانے والے نوجوانوں کو یہ درس دیا جاتا ہے کہ وہ دوسری زندگی کو یقینی خیال کریں۔ قاری ہم سے یہ سوال کر سکتا ہے کہ ''جناب اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے، یہ عقیدہ سکون بخش ہے اور اس سے کوئی نقصان بھی نہیں پہنچتا''۔ ہمارا جواب یہ ہوگا کہ یہ عقیدہ درحقیقت نقصان دہ ہے اور یہ ہمیں مندرجہ ذیل طریقوں سے نقصان پہنچاتا ہے:

(1) کوئی غیر معمولی طور پر ذہین بچہ غور و فکر کے بعد دریافت کر سکتا ہے کہ موت کے بعد زندگی کے حق میں دلائل ادھورے ہیں۔ تب استاد اس بچے کی حوصلہ شکنی کریں گے اور شاید مارنے پیٹنے بھی لگیں گے۔ یوں اس قسم کی سوچ کا میلان رکھنے والے دوسرے بچوں کی بھی حوصلہ شکنی ہوگی۔ وہ ایسے موضوعات پر گفتگو کرنے سے گریز کریں گے۔ ممکن

http://muftbooks.blogspot.com/

ہوا تو ان بچوں کو ایسی کتابوں کے مطالعہ سے بھی روک دیا جائے گا جو ان کے علم اور قوت استدلال میں اضافہ کرنے والی ہوں گی۔

(2) آج کے زمانے میں اوسط درجے سے زیادہ ذہانت کے حامل افراد چونکہ اکثر اوقات کھلم کھلا یا چوری چھپے مذہب کے مخالف ہوتے ہیں، اس لئے مذہبی تعلیم پر اصرار کرنے والے سکول کے اساتذہ یا تو بدھو ہوتے ہیں یا منافق۔ ہاں ایک چھوٹی سی جماعت سے بھی اس کا تعلق ہوسکتا ہے جو کسی دماغی خلل کی بنا پر ذہین مگر کوئی فیصلہ کرنے کے نا اہل افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ عملی طور پر ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ تدریسی شعبہ اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں وہ اوائل عمر ہی میں جرآت مندانہ خیالات کے لئے اپنے دل و دماغ کے دروازے بند کر لیتے ہیں۔ وہ ڈرپوک اور رسم پرست بن جاتے ہیں۔ دم کٹی لومڑی کی طرح وہ اپنے شاگردوں کو بھی یہ درس دینے لگتے ہیں کہ بزدلی اور رسم پرستی اچھے شے ہے۔ جب وہ کافی عرصے تک یہی راگ الاپتے رہتے ہیں تو افسران ان کی اس خوبی کو بھانپ لیتے ہیں۔ یوں انہیں قوت واختیار کے حامل عہدوں پر ترقی دے دی جاتی ہے۔ پس جو لوگ استاد کے طور پر اپنی ملازمت برقرار رکھ سکتے ہیں اور عملی زندگی میں کامیابی بھی حاصل کرتے ہیں، وہ زیادہ تر ایسے ہوتے ہیں جو مذہبی اور متعلقہ آزمائشوں پر پورے اترتے ہیں۔ یہ امر اساتذہ کے انتخاب کو محدود کر دیتا ہے اور ایسے بہت سے افراد کو تدریسی پیشے میں آنے سے روک دیتا ہے جو نوجوانوں کی ذہین اور اخلاقی نشوونما کے اہل ہوتے ہیں۔

(3) جب تک بعض معاملات کو متبرک اور ناقابلِ اعتراض سمجھا جاتا رہے گا، اس وقت تک نوجوانوں میں سائنسی روح پیدا نہیں کی جاسکتی۔ سائنسی رویئے کی اساس ہی یہ ہے کہ وہ ہر اعتقاد کے لئے شہادت طلب کرتا ہے۔ پھر وہ نتائج کی پرواہ کئے بغیر شواہد کی پیروی کرتا ہے۔ جب ہم کسی مذہب کے بقا کی خواہش کرتے ہیں کہ اس مذہب میں ''عظیم'' سچائیاں موجود ہیں۔ اس کی خاطر ہم سچائی کے خود ساختہ معیار مقرر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں خاص طور پر مقدس بزرگوں کے ایمان اور دل کے احساسات کا چرچا کیا جاتا ہے۔ مذہب کے سنہرے دنوں میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ عقل محض مذہب کے بنیادی عقائد کی سچائی ثابت کرسکتی ہے۔ اس زمانے میں احساس غیر ضروری تھا۔

http://muftbooks.blogspot.com/

خیر، وہ دن اب بیت چکے ہیں۔ اب جدید علمائے دین خاص طور پر جوشیلے الفاظ استعمال کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے قارئین میں ایسی ذہنی کیفیت پیدا کرسکیں جس میں استدلال کی معقولیت پر زیادہ توجہ نہ دی جاسکے۔ احساس و جذباتیت کا بے جا استعمال اصل میں ہمیشہ ہی موقف کے کمزور ہونے کی علامت ہوا کرتا ہے۔

اپنے ان دلائل کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ عقیدہ چاہے کوئی بھی ہو، تعلیم میں نقصان دہ ہوتا ہے جب اسے زیادہ سائنسی عقائد پر لاگو ہونے والی عقلی جانچ پڑتال سے مستثنیٰ قرار دے دیا جائے۔ بہرطور مسیحی ملکوں میں اکثر بچوں کو دی جانے والی مذہبی تربیت پر کئی اور اعتراضات بھی وارد ہوتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ مذہب ایک قدامت پسند قوت ہے۔ ماضی کی بہت سی برائیاں ابھی تک اس نے سمیٹ رکھی ہیں۔ اہلِ روم دوسری پیونک جنگ تک دیوتاؤں کے حضور انسانوں کی قربانی پیش کیا کرتے تھے۔ مذہب انہیں اس پر اکساتا تھا۔ مذہب نہ ہوتا تو وہ ایسی وحشیانہ حرکت کبھی نہ کرتے۔ اس طرح ہمارے زمانے میں مذہبی تحریک کے سبب لوگ ایسے کئی کام کرتے ہیں جو مذہب کے بغیر ناقابلِ برداشت حد تک ظالمانہ دکھائی دیتے ہیں۔ اکثر مذہبی لوگ آج بھی دوزخ کے وجود کو تو تسلیم کرتے ہیں۔ اچھا اگر آپ دوزخ کو مانتے ہیں تو پھر انتقامی سزا کو بھی جائز قرار دینا پڑے گا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دوزخ کے وجود میں یقین رکھنے والوں کے پاس تعلیم میں اور مجرموں کے معاملے میں ظالمانہ طریقے اختیار کرنے کا نظری جواز موجود ہوتا ہے۔ روزمرہ کے مشاہدے کی بات ہے کہ زمانہ امن اکثر علمائے دین امن پسندی کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ لیکن جونہی جنگ شروع ہوتی ہے وہ اس کی حمایت اور تائید کرنے لگتے ہیں۔ جنگ کی حمایت کرتے ہوئے یہ علمائے دین پورے جوش وخروش اور وثوق کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ خدا ان کے ساتھ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ قتل وغارت کو نامعقول قرار دینے والوں کی ایذارسانی کے لئے مذہبی جواز پیش کرتے ہیں۔ جب تک دنیا میں غلامی کا رواج تھا، اس کی تائید میں مذہبی دلائل تلاش کر لئے گئے تھے۔ آج کل ایسے ہی مذہبی دلائل سرمایہ دارانہ نظام کی لوٹ کھسوٹ کے جواز میں پیش کئے جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کم وبیش ہر قسم کے ظلم وتشدد اور بے انصافیوں کو منظّم مذہب کی تائید وحمایت حاصل رہی ہے۔ جب کہ اچھی تبدیلیاں

http://muftbooks.blogspot.com/

غیر مذہبی لوگوں کے اخلاقی احساس کی مرہونِ منت ہے۔

اس سلسلے کی دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مذہب ان لوگوں کو اطمینان بخشتا ہے جو اس پر ایمان لاتے ہیں۔ ایمان کے زوال کے بعد اس اطمینان کو چھوڑنا تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے۔ خدا اور دوسرے جہاں کی زندگی پر ایمان ہو تو پھر زندگی بسر کرنے کے لئے مفکرین کے مقابلے میں کم جرات اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہت سے نوجوان لوگ زندگی کی ایسی منزل پر ایمان سے محروم ہوتے ہیں جس پر مایوسی کا شکار ہونا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں ان لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ رنج اور تلخیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن کی تربیت غیر مذہبی انداز میں ہوئی ہوتی ہے۔ مذہب موت یا کائنات سے نہ ڈرنے کے حق میں دلائل پیش کرتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ حوصلہ و جرات کی مناسب تعلیم دینے میں ناکام رہتا ہے۔ مذہب کی خواہش چونکہ زیادہ تر خوف کا نتیجہ ہوتی ہے لہٰذا اس کے حامیوں کا رجحان فکر یہ ہوتا ہے کہ خوف کی بعض قسموں کو ناپسندیدہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ میرے نزدیک وہ اس معاملے میں سخت غلطی پر ہیں۔ خوف سے نجات پانے کے لئے پسندیدہ عقیدوں کی پناہ ڈھونڈنا زندگی بسر کرنے کا بہترین طریقہ نہیں ہے۔ جس حد تک مذہب خوف کا جذبہ ابھارتا ہے، اسی حد تک وہ انسانی وقار کو ضعف پہنچاتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر مذہب کو سنجیدگی سے قبول کیا جائے تو پھر دوسرے جہان کے مقابلے میں ہماری یہ دنیا غیر اہم محسوس ہونے لگتی ہے۔ ایک مذہبی آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس دنیا کے دکھ درد غیر اہم ہیں، کیونکہ وہ عارضی ہیں۔ اس کے مقابلے میں دوسری دنیا کی خوشیوں کو ترجیح دیتا ہے۔ اس نقطہ نظر کی نمایاں مثال جنس سے متعلق مسائل میں ملتی ہے جن پر ہم آئندہ باب میں بحث کریں گے۔ تاہم اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ مذہب میں ایمان رکھنے والے لوگ غربت اور بیماری جیسی برائیوں کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کی برائیوں کا تعلق فقط اس دنیا سے ہے۔ یہ نظریہ امیر لوگوں کے مفادات کے عین مطابق ہے۔ غالباً اسی لئے اکثر مالدار لوگ مذہب کے حامی ہوا کرتے ہیں۔ اگر کوئی دوسری زندگی ہے اور اگر جنت ہماری اس دنیا کے دکھ درد کا صلہ ہے، تو پھر مناسب یہی ہے کہ عارضی زندگی کی اصلاح میں رکاوٹ

http://muftbooks.blogspot.com/

ڈالی جائے۔ تب ہمیں سرمایہ داروں کے ایثار کی داد بھی دینی چاہئے کہ وہ ساری دولت خود سمیٹ کر دوسروں کو مصیبتیں اٹھانے کا موقع مہیا کرتے ہیں۔ لیکن اگر دوسری دنیا میں یقین مغالطہ آمیز ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم حقیقت کو چھوڑ کر سایوں تک پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ تب ہماری بدبختی ان لوگوں جیسی ہوگی جو زندگی بھر کی پونجی ایسے کاروبار کی نذر کر دیتے جس کا دیوالیہ نکل جاتا ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مذہبی تعلیمات کئی طریقوں سے اخلاق کو تباہ کرتی ہیں۔ خاص طور پر وہ خود اعتمادی کا ستیاناس کر دیتی ہیں۔ مذہب نوجوانوں کو اپنے آپ پر انحصار کرنے کے بجائے کسی بالاتر ہستی پر انحصار کرنے کا درس دیتا ہے۔ اس لئے وہ زندگی میں اپنی راہ آپ منتخب کرنے کے اہل نہیں رہتے۔ میں ایسے کئی لوگوں کو جانتا ہوں جن کی تعلیم و تربیت مذہبی طرز پر ہوئی تھی۔ جب انہوں نے مذہب کو تیاگ دیا تو ان کے طور طریقے افسوسناک ہو گئے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ اس امر کو مذہب کے حق میں دلیل کے طور پر پیش کریں اور دعویٰ کریں کہ اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ مذہب انسانوں کو نیک اطوار بناتا ہے۔ تاہم ہماری رائے اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ ارادے کی جس کمزوری کا اظہار ان لوگوں نے کیا وہ براہِ راست ان کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ بات یہ بھی ہے کہ جب مذہب کو اخلاقیات کی واحد بنیاد کے طور پر پیش کیا جائے تو جب کوئی شخص مذہب کو خیر باد کہتا ہے تو ساتھ ہی وہ اخلاقیات میں یقین کو بھی کھو سکتا ہے۔ ناول نگار سموئیل بٹلر کے ناول ''دی وے آف آل فلیش'' کے ہیرو کو ہم یہاں مثال کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ جونہی اس نے مذہب کو چھوڑا، اپنی نوکرانی کی عصمت دری کی۔ اچھا، اب نوکرانی کے ساتھ زنا نہ کرنے کی کئی معقول وجود موجود ہیں، لیکن ہیرو کو ان میں سے کسی ایک کی تعلیم بھی نہ دی گئی تھی۔ اسے تو بس یہ بتایا گیا تھا کہ یہ کام خدا کو پسند نہیں۔ چنانچہ جب خدا پر ایمان نہ رہا تو اسے نوکرانی پر جنسی حملہ نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی دکھائی نہ دے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ ہمارے زمانے میں ایمان کا فقدان ایک عام واقعہ ہے، اس قسم کی کمزور بنیاد پر تمام اخلاقی ضابطوں یا کم از کم اس کے ناگزیر حصوں کی مذہب پر بنیاد رکھنا محض حماقت ہے۔

مذہبی تعلیم کا ایک اور ناگوار پہلو یہ ہے کہ وہ ذہنی و عقلی خوبیوں کی اہمیت کو کم

http://muftbooks.blogspot.com/

کرتی ہے۔ ذہنی غیر جانبداری اہم ترین صفت ہے۔ لیکن مذہب اسے قطعی طور پر ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ مشکل مسائل کا فہم حاصل کرنے کی مسلسل جدوجہد کو بھی مذہب پسند نہیں کرتا۔ شاذ و نادر ہی وہ اسے قابلِ برداشت ٹھہراتا ہے۔ مذہب آج کے دور میں جن افراد کو قابلِ تعریف قرار دیتا ہے وہ شاید ہی کبھی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ مذہب اور نیکی کو عام طور پر ایک ہی شے سمجھا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اکثر مذہبی لوگ زیادہ ذہین نہیں ہوا کرتے۔ ان دونوں حقائق کے حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی تعلیم احمقوں کو تعلیم یافتہ لوگوں کی بالادستی کے خلاف مزاحمت کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ نظریہ ارتقاء اور ایسے ہی دوسرے سائنسی نظریات کی تدریس پر پابندی کے پس پردہ یہی بات کارفرما ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے مذہبی کتب میں عقل و فہم کی تعریف میں ایک لفظ بھی موجود نہیں۔ ان کتابوں میں جب عقل وفہم کی بات کی جاتی ہے۔ تو اس سے مراد ایک خاص قسم کی ''عقل'' ہوتی ہے یعنی وہ عقل جو مذہبی احکامات کی تعبیر کرتی ہے۔ مذہبی کتب خود عقل وفہم کو برداشت نہیں کرتیں۔ اس بات کو مذہبی تعلیمی اداروں میں پڑھائی جانے والی اخلاقیات کی ایک نمایاں خامی خیال کرنا چاہئے۔

مذہبی اخلاقیات کا بنیادی نقص یہ ہے کہ وہ ایسی وجوہ کی بناء پر بعض قسم کے افعال کو ''گناہ'' اور بعض کو ''نیکی'' قرار دیتی ہے جن کا ان افعال کے سماجی مضمرات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جس اخلاقیات کی بنیاد توہمات پر نہ ہو اسے سب سے پہلے لازماً یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ وہ کس قسم کے سماجی اثرات کو حاصل کرنا چاہتی ہے اور کس قسم کے سماجی اثرات سے بچنا چاہتی ہے۔ بعد ازاں اسے یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ ہمارے علم کی حد تک کس قسم کے افعال پسندیدہ نتائج کو قابلِ حصول بنائیں گے۔ وہ اخلاقیات اس قسم کے افعال کی تعریف کرتی ہے۔ جب کہ برعکس رجحان رکھنے والے افعال کی مذمت کرتی ہے۔

زمانہ قدیم کی اخلاقیات کا معاملہ یہ نہیں۔ وہ مذمت کرنے کے لئے چند طرزِ ہائے عمل کو منتخب کر لیتی ہے۔ اس انتخاب کے اسباب تاریخ کی بھول بھلیوں میں گم ہو چکے ہیں۔ مجموعی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ کامیاب قومیں ان افعال کی مذمت کرتی ہیں جو نقصان دہ ہوتے ہیں اور مفید افعال کی تعریف کرتی ہیں۔ البتہ تمام جزئیات کی یہ صورت نہیں۔ بعض لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ افادیت کے بجائے مذہبی اسباب کی بناء پر جانوروں

http://muftbooks.blogspot.com/

کو اول اول گھروں میں رکھنا شروع کیا گیا تھا۔ تاہم جن قبیلوں نے شیروں یا مگرمچھوں کو گھروں میں پالنا شروع کر دیا، وہ نیست و نابود ہو گئے۔ اس کے برعکس گایوں بکریوں کو پالنے والے پھلنے پھولنے لگے۔ اسی طرح جب مختلف اخلاقی ضابطے رکھنے والے قبائل آپس میں ٹکرائے تو کامیاب وہ رہے جن کا ضابطہ اخلاق کم بے ہودہ تھا۔ خیر، توہمات سے جنم لینے والا کئی ضابطہ بے ہودگی سے پاک نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح کی لغویات آج کے مذہبی ضابطہ اخلاق میں بھی موجود ہیں۔ تاہم وہ پہلے کے مقابلے میں کم ہوگئی ہیں۔ اتوار کے روز کام نہ کرنے کی پابندی کا عقلی جواز تلاش کیا جا سکتا ہے۔ تاہم کھیل و تفریح پر پابندی کا کوئی جواز نہیں۔ چوری کی ممانعت اچھی بات ہے، لیکن اس طرح نہیں جس طرح اس ضابطے کا اطلاق بعد از جنگ کے جرمنی کے کلیساؤں نے جلاوطن شہزادوں کی جائیداد کو قومی ملکیت میں لینے سے روکنے کے لئے کیا تھا۔ جنس کے معاملے میں مذہبی اخلاقیات کی توہمانہ اصلیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ تاہم یہ ایک وسیع موضوع ہے اور اس کے لئے ایک الگ باب کی ضرورت ہے۔

❁❁❁

http://muftbooks.blogspot.com/

نواں باب

تعلیم میں جنس

جنسی اخلاق اور ضابطوں کے بارے میں مہذب بالغ افراد کی آرا عام طور پر ان باتوں سے کافی مختلف ہوتی ہے جو وہ اپنے بچوں کو سکھانے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ آبادی کا ایک حصہ روایتی اخلاقی ضابطے کو ابھی تک پوری طرح قبول کئے ہوئے ہے، جب کہ دوسرے لوگ اس ضابطے کو محض برائے نام ہی قبول کرتے ہیں اور وہ بھی اس لئے کہ عام لوگوں کا احترام حاصل کر سکیں۔ عمومی صورت حال یہ ہے کہ جنس کے بارے میں روایتی نقطہ نظر رکھنے والے لوگ اس سے اختلاف کرنے والوں کے مقابلے میں اپنے نظریات کا پرچار کرنے میں زیادہ سنجیدہ اور مخلص ہوتے ہیں۔ جو لوگ اپنے طرزِ عمل اور اپنے دوستوں کے نجی طرزِ عمل سے متعلق اپنی آرا میں زیادہ وسعت نظر سے کام لینے پر آمادہ ہوتے ہیں، وہ شاذ و نادر ہی اپنی اخلاقیات کے بارے میں واضح ہوتے ہیں۔ جہاں تک روایتی ضابطے سے اختلاف کرنے کا تعلق ہے، وہ یہ کام شاید ہی کبھی کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ مزید براں ان کا یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ جنسی جذبے کا طوفان یقین طور پر عورتوں اور مردوں کو ہر قسم کے ضابطہ کی خلاف ورزی پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس لئے عمل میں درست حد تک آزادی غالباً اس وقت حاصل ہوتی ہے جب نظریہ اس سے زیادہ شدید ہو جتنا کہ سچائی کے تقاضے اجازت دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ کسی حالت میں بھی شادی کے سوا جنسی تعلق جائز نہیں ہے، وہ شدید محبت کے دباؤ کے تحت یہ محسوس کر سکتا ہے کہ اس کے اپنے معاملے میں حالات کی صورت اس قدر بدل گئی ہے کہ ضابطہ اخلاق میں لچک پیدا کرنے میں کوئی حرج نہیں رہا۔ اس طرح جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ شدید

http://muftbooks.blogspot.com/

محبت شادی کے بغیر بھی جنسی تعلق کو جائز بنا دیتی ہے، وہ ہر لمحاتی ترنگ کو شدید محبت قرار دینے پر تلا رہے گا۔ اسی طرح لمحاتی ترنگوں کو جائز سمجھنے والا شخص، بشرطیکہ ایسی ترنگیں دو طرفہ ہوں اور ان میں روپے پیسے کو دخل نہ ہو، ممکن ہے کہ دو طرف ہونے کی بات کو بھول جانے دے اور چپکے چپکے اس معاملے میں روپے پیسے سے بھی کام لینے لگے۔ ان طریقوں سے اکثر لوگ عملاً اپنے لئے اس سے زیادہ آزادی حاصل کر لیتے ہیں جتنی کہ ان کے عقائد اجازت دیتے ہیں۔ لہٰذا کسی قسم کی جنسی آزادی کی وکالت کرتے ہوئے ہمیشہ یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہئے کہ عملی طور پر جس قدر آزادی کو اختیار کیا جائے گا وہ عموماً اس سے زیادہ ہو گی جس کی وکالت کی جائے گی۔

بالغوں کے لئے جس کسی نظریئے کو بھی صحیح جنسی اخلاق قرار دیا جائے، یہ بات طے ہے کہ بچوں کی جنسی تعلیم سے متعلق بہت سے سوالات ایسے ہیں کہ جن پر بنیادی مسائل اُٹھائے بغیر فہم عامہ اور نفسیات کی بنیادوں پر غور کیا جا سکتا ہے۔ رواج یہ ہے کہ تعلیم کو ان لوگوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو خصوصیت سے جاہل، متعصب اور تنگ نظر ہوتے ہیں۔ خوشحال خاندانوں کے بچے زندگی کی ابتدائی برسوں میں اکثر اوقات ایسی اناؤں کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں جو عام طور پر کنواری اور لگ بھگ ہمیشہ ہی بناوٹی شرم وحیا کی ماری ہوتی ہیں۔ بعد ازاں جب وہ زیادہ تعلیم یافتہ خواتین کی نگرانی میں آتے ہیں تو عموماً یہ خواتین بھی غیر شادی شدہ ہوتی ہیں اور توقع یہ کی جاتی ہے کہ وہ نہایت عمدہ کردار کی مالک ہوں گی۔ گویا اس کا مطب یہ ہے کہ وہ بزدل، جذباتی اور حقیقت سے ڈرنے والی ہوں گی۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ان کی جنس کے بارے میں آرا غیر لچک دار اور جہالت پر مبنی ہوں گی۔ جہاں تک سکولوں کے اساتذہ کا تعلق ہے وہ گو لازمی طور پر کنوارے نہیں ہوتے لیکن ان سے بھی اعلیٰ اخلاق اور چال چلن کی اُمید کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عملی مسائل کو سائنسی نفسیات کے بجائے روایتی تعصب کے حوالے سے حل کریں گے۔ ان اساتذہ میں سے اکثر بچوں کی جنسی نفسیات کو ایک غلیظ موضوع قرار دیتے ہیں جس سے بے خبر رہنا ہی ان کے نزدیک اچھی بات ہے۔ وہ اپنی جہالت کے نقصان دہ مضمرات سے بے خبر ہی رہتے ہیں۔

بہت سے بچوں کو دو برس کی عمر تک پہنچنے تک ہی یہ سکھلا دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے

http://muftbooks.blogspot.com/

جنسی اعضا کو پراسرار اور خوفناک خیال کریں جن سے خاص انداز سے پیش آنا چاہئے۔ انہیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنی فطری ضرورتوں کو سرگوشی یا اشارے سے ظاہر کریں۔ جب کبھی انہیں اپنے جنسی اعضا کو ہاتھ لگاتے ہوئے دیکھ لیا جائے تو انہیں سخت ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیتی ہیں۔ میں بعض ایسے مردوں اور عورتوں کو جانتا ہوں کہ جن کو بچپن میں ان کی ماؤں نے اپنے جنسی اعضا کو مس کرتے دیکھ لیا تھا۔ اس پر یہ مائیں اس قدر برافروختہ ہوئیں کہ کہنے لگیں کہ اس سے بہتر تھا کہ وہ مر ہی جاتے۔ (اس قسم کے واقعات عام ہی ہیں) میں افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس رویئے نے روایتی خوبی کے نمونوں کو پیدا نہیں کیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نوجوان بچوں میں مشت زنی تقریباً عالمگیر ہے۔ فرائڈ نے کہیں لکھا ہے کہ جرمنی میں لڑکوں کو یہ کہہ کر ڈرایا جاتا ہے کہ سارس آئے گا اور ان کے اعضائے مخصوصہ کاٹ کر لے جائے گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب کبھی اتفاق سے وہ کسی لڑکی کو ننگا دیکھتے ہیں کہ سارس اس بے چاری کو نشانہ بنا چکا ہے۔ تحلیلِ نفسی کے ادب کے قارئین اس قسم کے حقائق سے بخوبی آگاہ ہیں۔ لیکن وہ لوگ اس ادب کو پڑھنا جرم سمجھتے ہیں جن کی اس ادب سے ناواقفیت نقصان کا موجب بنتی ہے۔ بعد کی زندگی میں پیدا ہونے والی اعصابی خرابیوں کا اکثر اوقات منبع وہ دھمکیاں ہوتی ہیں۔ جو مشت زنی کے نتائج کے خلاف بچوں کو دی جاتی ہیں اور جن سے وہ خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ سکول کے پورے زمانے کے دوران استاد بچوں کو یہ کہہ کر ڈراتے رہتے ہیں کہ مشت زنی سے پاگل پن پیدا ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ دھمکیاں جنون کی وجہ بنتی ہیں۔ جہاں تک خود مشت زنی کا تعلق ہے، اگر بالغ لوگ اس کے سلسلے میں بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ نہ کریں تو وہ بچوں کے لئے بہت ہی کم نقصان کا سبب بنتی ہے۔

بچوں کی پیدائش کے بارے میں جس رازداری سے کام لیا جاتا ہے، وہ بھی کئی برے اثرات کا موجب بنتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ بعض علوم برے ہیں اور خاص طور پر دلچسپ علم تو بہت ہی برا ہے۔ کسی اخلاقی ضابطے کے بنیادی اُصولوں میں سے ایک یہ ہونا چاہئے کہ تمام علم اچھا ہے اور یہ کہ اس میں کسی استثنا کے لئے جگہ نہیں۔ بچہ جب یہ محسوس کرتا ہے کہ بعض اُمور میں اس کے تجسّس کا جواب ڈانٹ ڈپٹ کی صورت میں دیا جاتا ہے تو پھر وہ یہ فرض کرنے لگتا ہے کہ علم اسی وقت اچھا ہوتا ہے جب

http://muftbooks.blogspot.com/

وہ غیر دلچسپ ہو۔ اور جب کبھی وہ دلچسپ ہو تو ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ اس طریقے سے سائنسی تجسس اور خوبی کے درمیان تضاد ابھر آتا ہے۔ یوں اچھا بننے کے لئے بچے کی تگ و دو اسے احمق بنانے کی کوشش بن کر رہ جاتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ایسا ہوتا بھی اکثر ہے۔ لڑکیوں کو حمل کے حقائق سے بے خبر رکھنا بہت برا ہے۔ لڑکیاں اپنے آپ کو لڑکوں سے کمتر سمجھنے لگتی ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ کاش وہ لڑکے ہوتے۔ جب تک انہیں حمل کے بارے میں علم حاصل نہ ہوا، انہیں بظاہر یوں دکھائی دیتا ہے کہ تقریباً تمام اُمور میں مرد عورتوں کے کردار کے متعلق علم حاصل ہوتا ہے، وہ اپنی صنف کے بارے میں ایک نیا احترام محسوس کرنے لگتی ہیں اور انہیں لڑکی ہونے پر ندامت کے بجائے ایک نئی قسم کا اطمینان ہونے لگتا ہے۔ اب اگر اس معاملے میں بچوں کو ماں کے کردار کے بارے میں تو بتا دیا جائے، لیکن باپ کے کردار کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ بات لڑکوں کے حق میں اسی طرح ناروا ہوگی جس طرح لڑکیوں کو بے خبر رکھنے کے معاملے میں تھی۔ مزید براں جو بچے باپ سے محبت کرتے ہیں انہیں یہ جان کر خوشی ہوتی ہے کہ ماں کی طرح ان کا جسمانی تعلق باپ سے بھی ہے۔ لڑکوں کی خودداری کے حوالے سے ان کے لئے پیدائش کے عمل میں باپ کے کردار کو جاننا اسی قدر ضروری ہے جس قدر لڑکیوں کے لئے حمل میں ماں کے کردار کو جاننا ہے۔

جنس کے حقائق پر مہر بہ لب رہنے کی پالیسی کا ایک اور برا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے یہ جان جاتے ہیں کہ والدین ان سے جھوٹ بولتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ بچے عموماً والدین کی توقع سے بھی پہلے سچی بات جان جاتے ہیں۔ سچائی کا علم ہونے کے بعد وہ ماں باپ سے اکثر سوال پوچھتے رہتے ہیں اور ان کے جھوٹے جوابات کو ایام شباب کی روکھائی کے ساتھ ذہن نشین کرتے رہتے ہیں۔ معلمّین اخلاق اگرچہ اس امر سے اتفاق نہیں کرتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بچوں کے ساتھ جھوٹ بولنا بری بات ہے۔ اس کا تقاضہ کرنے والا کوئی اخلاقی ضابطہ درست نہیں ہوسکتا۔

یہ بات ضروری ہے کہ جنسی موضوعات سے متعلقہ معلومات بچوں تک اسی انداز اور لہجے میں پہنچائی جائیں جس طرح دیگر موضوعات کی معلومات انہیں فراہم کی جاتی ہیں۔ مزید براں جنسی معلومات واضح اور صاف الفاظ میں مہیا کی جانی چاہئیں۔ ایک

http://muftbooks.blogspot.com/

خاص مکتبہ فکر کے حامیوں کا کہنا یہ ہے کہ پہلے بچوں کو پھولوں کی محبت کے بارے میں درس دیا جائے۔ پھر مچھلیوں کے معصول کھیلوں کا ذکر کیا جائے۔ اس طرح طویل تمہید کے بعد بچوں کو ان کے اپنے ماں باپ کے آپس کے میل ملاپ کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں۔ میں ان صاحبان سے اتفاق نہیں کرتا۔ میرے نزدیک صرف خوف زدہ افراد ہی اس لمبی چوڑی تمہید کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ بچوں کا معاملہ یہ ہے کہ اگر بڑوں کی مصنوعی شرم وحیا نے ان کو خراب نہ کر دیا ہو تو وہ جنس کو بھی دیگر موضوعات کی طرح فطری خیال کرتے ہیں۔

ماں باپ اگر خود جنس کے موضوع پر بچوں سے سیدھی طرح بات نہیں کر سکتے تو پھر یہ معاملہ کسی ایسے شخص کے سپرد کر دینا چاہئے جو اس مسئلے پر کسی رکاوٹ کے بغیر آزادی سے گفتگو کرنے کے قابل ہو۔ بلوغت سے پہلے جنس سے متعلق بچے کے طرز فکر وعمل کو فطری رکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ ساری زندگی یہی رویہ برقرار رہنا چاہئے۔ تاہم بلوغت کے بعد ایسا رویہ اختیار کرنا زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر بچوں کی پال پوس دانش مندی سے ہو تو پھر ایسی کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

بڑی عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ جو مسائل پیش آتے ہیں، کسی مثبت جنسی اخلاقیات کے بغیر ان سے نمٹنا مشکل ہے۔ عام نقطہ نظر یہ ہے کہ ان لڑکوں اور لڑکیوں کو مکمل پاک دامنی سے کام لینا چاہئے اور یہ کہ اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ برطانیہ میں عورتوں اور مردوں کو جدا کر کے جنسی مخالفت کے باعث جنسی تجربے کی راہ روکی جاتی ہے۔ صرف چند غیر معمولی طور پر مہم جو نوجوان ہی اس علیحدگی کو ختم کر سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو زیادہ چالاک ہوتے ہیں وہ ہم جنس پرستی کی راہ اپنا لیتے ہیں، جب کہ ڈرپورک قسم کے نوجوان مشت زنی میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ لڑکوں کو یہ بتایا جاتا ہے، اور ان میں سے کئی یقین بھی کر لیتے ہیں کہ یہ کام شیطانی اور نقصان دہ ہیں۔ انہیں رازداری سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ ان باتوں کا کسی کو پتہ چل جائے تو سخت سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ اس قسم کی باتوں کا پتہ حادثاتی اور اتفاق طور پر ہی چلتا ہے۔ اس لئے سزا بلا جواز تلون مزاجی سے دی جاتی ہے۔ جن کا پتہ نہیں چلتا، ان پر سزا کا خوف اور پردہ رکھنے کا بوجھ برا اثر ڈالتا ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

پبلک سکولوں میں نیکی پر ذہانت کو قربان کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ یوں وہ بچوں کو اس قدر مصروف اور جسمانی طور پر اس قدر تھکاوٹ زدہ رکھتے ہیں کہ انہیں جنس کے لئے فرصت اور رغبت دونوں کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس طرح موجودہ نظام میں مندرجہ ذیل نقائص پائے جاتے ہیں: اول یہ کہ وہ بچوں کے ذہن میں توہم پرستانہ قسم کی دہشت پیدا کر دیتا ہے۔ دوئم، وہ بچوں کی بڑی تعداد کو بزدل منافق بنا دیتا ہے۔ سوئم، وہ جنسی موضوعات سے متعلق خیالات اور احساسات کو فحش اور پر اسرار بنا دیتا ہے۔ چوتھے وہ سائنسی تجسّس کو گناہ آلود بنا کر پیش کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں یہ تجسّس یا تو ختم ہونے لگتا ہے یا پھر بیمارانہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ پانچویں اور آخری بات یہ ہے کہ موجودہ نظام فرصت کی حوصلہ شکنی کرتا ہے اور یوں اصل میں وہ عقلی نشوونما کی راہ روکتا ہے۔

موجودہ نظام کی خامیاں خیر اپنی جگہ ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ پورے ضابطہ اخلاق کو مکمل طور پر تبدیل کئے بغیر کسی ایسے نظام کا تصور کرنا سہل نہیں جو سنگین قسم کے اعتراضات سے پاک ہو۔ جدید معاشرے کے اکثر مردوں کے لئے سن بلوغت اور شادی کے درمیان بہت سے برسوں کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ان برسوں کے دوران انہیں مکمل طور پر پاک دامن رہنا چاہئے تو بھی اکثر مرد ایسا نہیں کریں گے۔ اس کے باوجود جب تک موجودہ اخلاقی نظام قائم ہے، وہ نقصان اٹھائے بغیر اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ طوائفوں کے پاس جانا بری بات ہے۔ اول تو اس سے بیماری لگنے کا خدشہ ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ طوائف کا پیشہ غیر پسندیدہ ہے۔ کم از کم اس وقت تک تو یہ پیشہ ضرور ناپسندیدہ ہے جب تک طوائفوں کو برا خیال کیا جاتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے اولین جنسی تجربات احساسات و جذبات سے محروم اور روپے پیسے کے لین دین پر مبنی ہوں تو پھر خدشہ یہ رہتا ہے کہ شادی کے بعد وہ بیوی کو طوائف خیال کرنے لگتا ہے یا دیوی سمجھتا ہے۔ یہ دونوں تصورات پر مسرت ازدواجی زندگی میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

سنِ بلوغت کو پہنچنے کے بعد مشت زنی کی عادت اگرچہ اس قدر نقصان دہ نہیں جتنی کہ روایتی اخلاقی کے علمبردار دعویٰ کرتے ہیں، تاہم اس سے چند خرابیاں ضرور پیدا ہوتی ہیں۔ اس عادت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی اپنی ذات میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اور اس میں جرات مندی ختم ہو جاتی ہے۔ بسا اوقات اس کی فطری جنسی تعلق کی صلاحیت بھی متاثر

http://muftbooks.blogspot.com/

ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ ہم جنس تعلقات اس قدر نقصان دہ نہ ہوں، بشرطیکہ انہیں برداشت کیا جاتا ہو۔ تاہم ان میں بھی یہ خدشہ موجود رہتا ہے کہ کہیں فطری جنسی زندگی کو ضعف نہ پہنچ جائے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کو اگر ایک دوسرے سے جدا نہ رکھا جائے تو ان کے درمیان جنسی تعلقات کے عام ہونے کا ڈر رہتا ہے۔ اس سے نہ صرف تعلیم کے عمل کو سنگین خطرہ لاحق ہو جائے گا بلکہ زندگی کے ایسے مرحلے پر حمل کے واقعات بھی وقوع پذیر ہونے لگیں گے جو اس کام کے لئے موزوں نہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ معاشرہ اور رائے عامہ کی موجودہ صورت میں اس مسئلے کا کوئی حل ممکن ہے۔ شاید کبھی ایسا زمانہ آئے گا جب ہمارے موجودہ اخلاقی نظام کی وجہ سے عنفوان شباب میں پیدا ہونے والی نفسیاتی خرابیوں پر سنجیدگی سے توجہ دی جائے گی اور یوں لڑکوں اور لڑکیوں کو اس قسم کی آزادی دے دی جائے گی جو آج کل سمودا اور بحرالکاہل کے کئی دوسرے جزیروں میں انہیں حاصل ہے۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو پھر نوجوانوں کو مانع حمل تدابیر کی تربیت دینی پڑے گی۔ ان کے باوجود حمل ہو جائے تو اسے فوراً ختم کرنا ہوگا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ صورتحال میرے لئے پسندیدہ ہوگی۔ شاید یہ دریافت بھی ہوسکتا ہے کہ بلوغت کے برسوں میں پاک دامنی اس وقت ناقابلِ برداشت بوجھ کا سبب نہیں بنتی، جب یہ توقع موجود ہو کہ بیس برس کی عمر کے لگ بھگ پہنچنے کے بعد ضبط کی ضرورت نہ رہے گی۔ یہ چیز جج لنڈزے کے تجویز کردہ دوستانہ شادی کے نظام کو نافذ کر کے حاصل کی جاسکتی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر یونیورسٹی کے طالبِ علموں کو عارضی اور بے اولاد شادیوں کی اجازت دے دی جائے تو اس سے ذہنی اور اخلاقی دونوں اعتبار سے یونیورسٹی کی زندگی کا معیار بہتر ہوسکتا ہے۔ اس طرح جنسی خواہش کا ایسا حل مل جائے گا جس میں نہ بے چینی ہوگی نہ رازداری کی ضرورت۔ اس میں نہ تو روپے پیسے کا دخل ہوگا نہ محض اتفاق کا۔ اس حل کی نوعیت ایسی ہوگی کہ جو وقت کام کے لئے درکار ہوتا ہے، وہ خواہ مخواہ کی سرگرمیوں میں ضائع نہ ہوگا۔

جنسی اخلاقیات کے بارے میں کوئی بہت صریح نظریہ قائم کرنے کی ضرورت کے بغیر ہی تعلیم میں جنس کے سوال کو بلوغت سے پہلے ذہنی صحت کے تقاضوں کے مطابق حل کیا جاسکتا ہے۔ تاہم جب تک ہم اس بارے میں خاصی واضح حد تک آرا قائم نہ کرلیں کہ

http://muftbooks.blogspot.com/

جنسی طرزِ عمل میں ہمارے نزدیک کیا شے پسندیدہ ہے اور کیا غیر پسندیدہ، اس وقت تک سکول کے آخری برسوں اور یونیورسٹی میں یہ طے کرنا دشوار ہوتا ہے کہ جنسی اُمور کے ساتھ کس طرح نمٹا جائے۔ عہدِ حاضر میں اکثر لوگوں کی جنسی اخلاقیات بے ترتیب اُصولوں کا ملغوبہ ہے۔ یہ اُصول زیادہ تر تین ذرائع سے حاصل کئے گئے ہیں۔ اول بیویوں کی پرہیز گاری پر اصرار جو پدری خاندان کے ادارے کے لئے ضروری ہے۔ دوئم یہ مذہبی تصور کہ شادی کے بغیر ہر قسم کی جنس گناہ ہے اور تیسرے عورتوں کی مساوات کے بارے میں جدید ترین نظریہ۔

ان تینوں عناصر میں سے پدری خاندان سے اخذ شدہ عنصر قدیم ترین ہے۔ آج کے جاپان میں اسے بقیہ دو عناصر کے بغیر دیکھا جا سکتا ہے۔ جاپان کے لوگ ہر قسم کی جنسی ممانعتوں سے بہت آزاد ہیں اور ان کی جنسی اخلاقیات میں بہت کم توہمات شامل ہیں۔ وہاں خاندان کا پدری نظام بڑی مضبوطی سے رائج ہے۔ یہ نظام تجریدی قسم کی اخلاقی وعظ بازی کے بجائے بیویوں کی ماتحتی کے حوالے سے قائم ہے۔ جاپان میں نوجوان کو اس قدر جنسی علم، جنسی گفتگو اور جنسی کھیل کود کی اجازت حاصل ہوتی ہے کہ جسے دیکھ کر یورپی لوگ بھی حیران رہ جاتے ہیں۔ بالغ زندگی کی اخلاقیات کا اطلاع صرف عورتوں پر ہوتا ہے اور یہ اخلاقیات ان پر مردوں کی برتر قوت کے ذریعے بے رحمی سے ٹھونسی جاتی ہے۔ اصل میں یہ ایک قدیم نظام ہے جو مسیحی تہذیب سے پہلے کے زمانے میں کم وبیش ساری دنیا میں رائج تھا۔

ابتدائی دور کی عیسائیت نے اس عقیدے کی اشاعت کی کہ جنس فطری طور پر ناپاک ہے اور یہ کہ صرف نسل انسانی کے تسلسل کی خاطر ہی اسے برداشت کیا جا سکتا ہے۔ جنس اگر شادی تک ہی محدود رہے تو بھی مشکل ہی سے تجرد کی زندگی کے مساوی قابلِ احترام ہوتی ہے۔ یہاں میں یہ دعویٰ نہیں کر رہا کہ عیسائیت کے ظہور سے پہلے اس قسم کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ دراصل انسانی فطرت میں ایسا کوئی عنصر پایا جاتا ہے جو انسان کو جنس مخالف احساسات کو قبول کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ عیسائیت نے اس عنصر کو متوجہ کیا تھا یہودیوں کے ہاں بھی جنس کے خلاف مضبوط قسم کے احکامات موجود تھے۔ تاہم وہ خود جنس کو ناپاک نہ سمجھتے تھے۔ تاریخ میں پہلی بار مسیحی اخلاقیات نے عورتوں اور مردوں کو مساوی قرار دیا تھا۔ تاہم عملی صورت حال یہ تھی کہ پاک دامنی سے گریز پر عورتوں کے مقابلے میں

http://muftbooks.blogspot.com/

مردوں کے ساتھ زیادہ نرم سکوک کیا جاتا تھا۔ اسی طرح عملی طور پر عیسائیت نے ویسی ہی صورت حال پیدا کر دی جو اس سے پہلے کی تہذیبوں نے پیدا کی تھی۔ البتہ ان دونوں میں یہ عظیم نفسیاتی فرق قائم رہا کہ مردوں کی جنسی آزادیوں کو گناہ قرار دیا جانے لگا۔

جنسی مساوات کے نظریئے کے فروغ سے اس نظام کو ضعف پہنچا ہے۔ اس نظریئے کے حامیوں کا کہنا یہ تھا کہ یا تو مرد عورتوں جتنے پاک باز ہو جائیں گے یا پھر عورتوں کو بھی اتنا ہی غیر محتاط ہونے کا موقع دیا جائے گا جتنے کہ مرد ہوتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اگر عورتوں سے پاک دامنی کا مطالبہ نہ کیا جائے تو خاندان کے قدری نظام کو برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اب اگر اس خاندانی نظام کو ختم کرنا ہے تو اس کے لئے سماجی ڈھانچے میں گہری تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ اس طرح یہاں الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ مردوں کے لئے مسیحی اخلاقیات ہمیشہ سے سخت رہی ہے۔ اگر عورتوں کو بھی مردوں جتنی آزادی مل جائے تو انہیں بھی یہ اخلاقیات نا قابلِ برداشت حد تک سخت محسوس ہوں گی۔

جہاں تک خاندان کا تعلق ہے، یہ ایک ایسا سماجی ادارہ ہے جس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ مرد اس کی تشکیلِ نو پر رضامند نہ ہوں گے۔ اس ساری الجھن میں صاف راہ یہی ایک دکھائی دیتی ہے کہ ریاست باپ کی جگہ لے لے ..... یہ ایسا نظام ہے کہ جو اشتراکیت کے تحت آسانی سے قائم ہو سکتا ہے۔ البتہ نجی ملکیت اور وراثت کے نظام والے معاشرے میں اسے اختیار کرنا آسان نہ ہوگا۔ اس طریقے سے نجی ملکیت کا سوال جنسی اخلاق کے مسئلے سے مربوط ہو جاتا ہے۔ کسی شخص سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایسے بچوں کی پال پوس کے لئے محنت مزدوری کرے گا جو ممکن ہے کہ اس کے اپنے نہ ہوں۔ لہٰذا پدری خاندانی نظام کے ساتھ مل کر نجی ملکیت کا نظام بیویوں سے ایک خاص حد تک پاک دامنی کا تقاضا کرتا ہے۔

دوسری طرف بیویوں سے پاک دامنی کا مطالبہ کرنا لیکن مردوں کو کھلا چھوڑ دینا جنسی مساوات کے تصور کے خلاف ہے۔ یوں بات یہ سامنے آتی ہے کہ جبر یا گناہ کے تصور کے بغیر عورتوں کو پاکباز رکھنا دشوار ہے۔ مجھے تو اس بارے میں کم ہی شبہ ہے کہ اس مسئلے کا حل باپ کی اہمیت میں واقع ہونے والی بڑی کمی اور باپوں کے بجائے بچوں کی پرورش کو ریاست کے حوالے کرنے کے بڑھتے ہوئے رجحان ہی میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ میں

http://muftbooks.blogspot.com/

یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آیا یہ کوئی اچھی بات ہو گی۔ تہذیب کی تاریخ میں ولدیت کا احساس اور باپ کے لئے بیٹے کے جذبات نہایت گہرے طور پر اہم عناصر رہے ہیں۔ میں یہ جاننے کا دعویدار نہیں کہ ان عناصر کے بغیر تہذیب کس قسم کی صورت اختیار کرے گی۔ خیر اچھائی اور برائی سے قطع نظر یہ امر طے شدہ ہے کہ بچوں کے معاملے میں ریاست کی اہمیت بڑھتی چلی جائے گی۔ اسی حساب سے باپ کی اہمیت کم ہوتی جائے گی۔

نوجوانوں کی تعلیم سے تعلق رکھنے والے صاحبان ان تمام جدید مسائل اور الجھنوں پر توجہ دینے سے انکار کرتے ہیں۔ وہ اس عقیدے کو قبول کئے ہوئے ہیں کہ مذہبی اخلاقیات کو اگر بالغ افراد پر نافذ نہیں کیا جا سکتا تو بھی اسے ان لوگوں پر ٹھونسنا ضروری ہے جن کی نگرانی میں بچے دیئے جاتے ہیں۔ سکولوں اور برطانوی یونیورسٹیوں کا اخلاقی رویہ باقی دنیا کے مقابلے میں زیادہ سخت ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم اس معاشرے سے بتدریج دور ہوتی جا رہی ہے جس کے لئے نوجوانوں کو تیار کرنے کی ذمہ داری اس کے سپرد کی گئی ہے۔ جنسی مساوات اور خاندان کا پدری نظام کے درمیان چونکہ بنیادی تضاد موجود ہے، اس لئے جب تک رائے عامہ اور سماجی اداروں کی موجودہ صورت برقرار رہے گی اس وقت تک میرے خیال میں اس مسئلے کا کوئی واضح حل ممکن نہیں ہے۔ بہرطور اس تضاد کے باوجود عام اخلاقی اُصولوں کو پیشِ نظر رکھنے اور جنس کے بارے میں توہمات کو مسترد کرنے سے کئی ایک مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔

یہ ایک حتمی اُصول ہونا چاہئے کہ بچوں کے ساتھ معاملات طے کرتے ہوئے کسی طور بھی جھوٹ سے کام نہ لیا جائے گا۔ اس امر کو بھی حتمی اُصول کی حیثیت حاصل ہونی چاہئے کہ ہر قسم کے موضوعات پر عقلی غور و فکر ہو سکتا ہے اور اسے سائنسی طریقے سے حل کیا جا سکتا ہے۔ اگر پدری خاندان کے تحفظ کو اخلاقیات کی بنیاد رکھنا مقصود ہے تو پھر یہ سمجھنا دشوار ہے کہ ان جنسی معاملات کو کس طرح گناہ آلود قرار دیا جا سکتا ہے جن سے اولاد نہ پیدا ہوتی ہو۔ حالانکہ عام طور پر اس قسم کے معاملات کو نہ صرف مسیحی اخلاقیات بلکہ فوجداری قانون بھی زیادہ ہی خطرناک قرار دیتا ہے۔

ہمیں اس چیز کا احساس بھی کرنا چاہئے کہ اگر کوئی طرزِ عمل بذات خود پسندیدہ ہو تو بھی یہ بات غیر پسندیدہ ہو سکتی ہے کہ اسے بے لچک نظم و ضبط یا مریضانہ وہراس کے

http://muftbooks.blogspot.com/

ذریعے نافذ کیا جائے۔ یہ اُصول نوجوانوں کی اخلاقی تعلیم کے ایک بڑے حصے پر حاوی ہیں۔ جہاں تک بقیہ حصے کا تعلق ہے، میرے خیال میں اس کے لئے ہمیں ان دنوں کا انتظار کرنا چاہئے جب کہ ہماری انتشار زدہ اور تیزی سے تغیر پذیر سماج کوئی زیادہ مستحکم صورت اختیار کرلے گا۔

نوجوانوں کے ساتھ بات چیت اور دوسرے معاملات میں یہ بات اہم ہے کہ کسی طور انہیں یہ احساس نہیں دلانا چاہئے کہ جنس گندی اور پوشیدہ رکھنے والی چیز ہے، جنس ایک دلچسپ موضوع ہے اور انسانوں کا اس کے بارے میں سوچنا اور باتیں کرنا بالکل فطری امر ہے۔ موجودہ صورتحال یہ ہے کہ نوجوانوں کی طرف سے اس مکمل طور پر فطری خواہش کے اظہار کو صاحبان اختیار بے راہ روی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ توقع کے برخلاف نکلتا ہے۔ چنانچہ جنسی اُمور میں نوجوانوں کی دلچسپی پہلے سے بھی بڑھ جاتی ہے اور وہ مسلسل اس بارے میں اس طرح مزے لے کر گفتگو کرتے ہیں جیسا کہ ہر ممنوعہ ثمر کے بارے میں ہوتا ہے۔ یہ گفتگو لازماً جاہلانہ اور احمقانہ ہوتی ہے، کیونکہ نوجوانوں کو ان کے اپنے تخیل کی اُڑان اور خام علم کے حوالے کردیا جاتا ہے۔ اکثر لڑکوں کے لئے جنس کا پورا موضوع ہنسی ٹھٹھا اور گندی کہانیوں کا معاملہ بن کر رہ جاتا ہے۔

فطری مسرت کے سرچشمہ کی حیثیت سے جنس کا پورا تصور جو کبھی تخلیق شعر کا سبب بنتا ہے، کبھی خوش وشادمانی سے ہمیں لبریز کردیتا ہے اور کبھی المیہ گہرائی کے ساتھ پرجوش ہوتا ہے، ان مدرسی اخلاق پرستوں کے دائرہ بصیرت سے خارج ہے جن کے خیال میں مسرت انگیز جنس گناہ ہے۔ وہ جنس کو صرف اسی وقت اچھا سمجھتے ہیں جب وہ بے لطف اور عادی قسم کی ہو۔ یہ بدصورتی کی اخلاقیات شاعری، خوشی اور خوبصورتی کو زندگی سے خارج کردیتی ہے۔ وہ انسانی رشتوں میں کڑواپن اور بے لطفی پیدا کردیتی ہے۔ یہ رویہ مصنوعی شرم وحیا اور تنگ نظری کا سبب بنتا ہے اور تخیل کو تباہ کردیتا ہے۔ ممکن ہے کہ زیادہ آزاد رویئے میں بھی خطرات مضمر ہوں۔ تاہم وہ موت کے بجائے زندگی کے خطرے ہوں گے۔

❁❁❁

http://muftbooks.blogspot.com/

دسواں باب

تعلیم میں حب الوطنی

ہر شخص کے بہت سے مقاصد اور خواہشیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض بالکل ذاتی ہوتی ہیں اور بعض ایسی ہوتی ہیں جن میں وہ دوسروں کو شریک کرسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اکثر لوگ دولت کے آرزومند ہوتے ہیں اور دولت کمانے کے اکثر طریقے ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے کسی گروہ کا تعاون ضروری ہوتا ہے اس گروہ کا تعین دولت کمانے کے طریقے سے ہوتا ہے۔ اکثر صورتوں میں ایک ہی کاروبار سے تعلق رکھنے والے دو مختلف ادارے ایک دوسرے کے رقیب ہوا کرتے ہیں۔ البتہ تحفظ مہیا کرنے والے محصول کے معاملے میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔

خیر، دولت ہی وہ واحد شے نہیں ہے جس کی خاطر لوگ سیاسی قسم کے گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مذہبی فرقوں، برادریوں، علمی وفکری گروہوں اور بے شمار دوسری جماعتوں میں بٹ جاتے ہیں۔ انسانوں کو تعاون واشتراک پر اکسانے والے محرکات بہت سے ہیں۔ مفاد کی یکسانیت ایسا ہی ایک محرک ہے، جب کہ آراء میں ہم آہنگی اور خون کے رشتے ناطے دیگر محرکات ہیں۔ روتھس چائلڈ خاندان نے خون کے رشتوں کی اساس پر تعاون کو فروغ دیا۔ اس خاندان کے افراد ایک دوسرے پر اعتماد کر سکتے تھے، لہٰذا انہیں رسمی تکلفات کی ضرورت نہ تھی۔ ان کی کامیابی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ یورپ کے ہر قابلِ ذکر مالیاتی مرکز میں خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد موجود تھا۔ نقطہ نظر کی اکائی پر مبنی تعاون کی مثال جنگ اول کے بعد عیسائیوں کے مذہبی فرقہ کوئیکر کے انسان دوست کام میں ڈھونڈی جاسکتی ہے۔ خیالات کی ہم آہنگی کے سبب اس فرقے کے لوگ آسانی سے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کے قابل تھے۔ جوائنٹ سٹاک

http://muftbooks.blogspot.com/

کمپنیوں اور ٹریڈ یونینوں جیسی تنظیموں میں مفاد کی ہم آہنگی کی اساس پر باہمی اشتراک کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

جب لوگ کسی مقصد کی خاطر گروہ کی صورت میں منظّم ہوتے ہیں تو ان کا اجتماع محض اسی مقصد کے حوالے سے ہوتا ہے۔ لہٰذا اس گروہ یا جماعت کی ذہنیت فرد کے مقابلے میں زیادہ سادہ اور خام تر ہوتی ہے۔ آیئے ہم یوں کہتے ہیں کہ نفسیاتی تحقیق کی انجمن صرف نفسیاتی تحقیق سے سروکار رکھتی ہے، حالانکہ اس کے تمام ارکان کو اور بھی بہت سے معاملات سے دلچسپی ہوتی ہے۔ برطانوی صنعت کی فیڈریشن صرف برطانوی صنعت میں دلچسپی لیتی ہے، حالانکہ انفرادی طور پر اس کے ارکان کو کرکٹ کھیلنے یا کرکٹ میچ دیکھنے کا شوق بھی ہوسکتا ہے، مجموعی طور پر کوئی خاندان صرف خاندانی جائیداد کے اُمور کی دیکھ بھال کرتا ہے اور عام طور پر وہ اس مقصد کے لئے اپنے انفرادی ارکان کو قربان کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔

سیاسی طور پر منظّم ہونے والے جذبات غیر منظّم رہ جانے والے جذبوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ اتوار کے روز فلم دیکھنے کے لئے سینما جانے کے خواہش مند لوگ مکمل طور پر غیر منظّم ہجوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی سیاسی اہمیت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ لیکن اس مذہبی جماعت کے لوگ زیادہ منظّم اور زیادہ سیاسی اثر ورسوخ کے حامل ہوتے ہیں جو ان لوگوں کو فلم کی تفریح سے روکنا چاہتے ہیں۔ سینما کے مالکان بھی منظّم ہوتے ہیں۔ لہٰذا سیاسی حوالے سے دیکھا جائے تو اتوار کے روز سینما گھروں کو کھولنے کا مسئلہ سینما مالکان اور مذکورہ مذہبی جماعت کے درمیان جھگڑے کی حیثیت رکھتا ہے جس میں عوام کی خواہشوں کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔

کوئی خاص شخص کئی جماعتوں کا رکن ہوسکتا ہے جن میں بعض مفید، بعض نقصان دہ اور بعض بے ضرر ہوسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ فسطائیوں کی جماعت، اپنے گاؤں کی فٹ بال کلب اور انسانیاتی تحقیق کی انجمن کا رکن ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تیسری حیثیت سے وہ قابلِ تعریف، دوسری حیثیت سے بے ضرر اور پہلے حیثیت سے قابلِ نفرت ہے۔ بذاتِ خود وہ اچھائی اور برائی کا مجموعہ ہے۔ تاہم ان جماعتوں کا اخلاقی کردار اچھا یا برا جو بھی ہو، غیر مخلوط ہوتا ہے اور وہ ان کے ارکان میں نہیں پایا جاتا۔ لوگ جس مقصد کی

http://muftbooks.blogspot.com/

خاطر منظّم ہوتے ہیں وہی مقصد ان کی جماعت کے اچھا یا برا ہونے کا تعین کرتا ہے۔ اس تعین کا دارومدار جماعت میں اکھٹے ہونے والے لوگوں کے کردار پر نہیں ہوتا۔

ان عام سی باتوں کو یہاں دہرانے کا مقصد ان غیر معمولی نتائج تک رسائی حاصل کرنا ہے جو ریاستوں کی صورت میں انسانوں کے منظّم ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ کم وبیش تمام مہذب ملکوں میں ریاست وہ سب سے زیادہ طاقت ور تنظیم ہوتی ہے جس سے انسان کا تعلق ہوتا ہے۔ لہٰذا ریاست کا رکن ہونے کی حیثیت سے اس کے مقاصد سیاسی اعتبار سے دوسرے تمام مقاصد سے زیادہ موثر ہوتے ہیں۔ یہ بات اہم ہو جاتی ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ جدید ریاست کے مقصد کیا ہیں۔

ریاست کے فرائض داخلی ہوتے ہیں اور خارجی بھی۔ اس مقصد کے لئے میں مقامی حکومت کو بھی ریاست کے فرائض میں شمار کرتا ہوں۔ سرسری طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ریاست کے داخلی فرائض اچھے ہوتے ہیں جب کہ خارجی عزائم برے ہوتے ہیں۔ بلاشبہ یہ بیان اس قدر سادہ ہے کہ ہمیں اس کے مکمل طور پر درست ہونے کی توقع نہ کرنی چاہئے۔ ریاست کے داخلی مقاصد میں سڑکیں، روشنی، تعلیم، پولیس، قانون، ڈاک خانہ جیسے فرائض شامل ہیں۔ انتظام اور نظم ونسق کی کسی تفصیل کے بارے میں کسی شخص کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ تاہم کوئی انتشار پرست ہی یہ کہے گا کہ اس قسم کے مقاصد بذاتِ خود غیر پسندیدہ ہیں۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں تک داخلی سرگرمیوں کا تعلق ہے ریاست مجموعی طور پر شہریوں کی وفاداری اور حمایت کی مستحق ہے۔

جب ہم ریاست کے خارجی عزائم کا جائزہ لیتے ہیں تو صورتحال بدل جاتی ہے۔ باقی دنیا کے حوالے سے دیکھا جائے تو کسی بڑی ریاست کے مقاصد دو ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ جارحیت کے خلاف دفاع کیا جائے اور دوسرے یہ کہ بیرونی دنیا کے استحصال میں اپنے شہریوں کی مدد کی جائے۔ جارحیت کے خلاف دفاع اگر حقیقی ہو اور بیرونی حملے کو روکنے کے لئے ضروری ہو تو اسے مفید قرار دیا جا سکتا ہے۔ تاہم مشکل یہ ہے کہ مزاحمت کے لئے جن وسائل کی ضرورت ہوتی ہے، ان کو آسانی کے ساتھ بیرونی استحصال کے لئے بھی بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ بڑی ریاستیں چھوٹے ملکوں کی محنت اور قدرتی وسائل سے فائدہ اُٹھانا چاہتی ہیں۔ اس مقصد کی خاطر وہ ان مسلح افواج کو استعمال

http://muftbooks.blogspot.com/

کرتی ہیں جن کا ظاہری مقصد ملکی دفاع ہوتا ہے۔ مثلاً جب یہ حقیقت منظرِ عام پر آئی کہ ٹرانسوال میں سونا موجود ہے تو برطانیہ نے اس پر حملہ کر دیا۔ تب لارڈ سالسبری نے قوم کو یقین دلایا تھا کہ اس حملے کا مقصد سونے کی کانوں پر قبضہ کرنا نہیں۔ پھر بھی کسی نہ کسی طور انگریز سونے کی کانوں تک پہنچ گئے اور جب جنگ ختم ہوئی تو ان کانوں پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ایک اور مثال لیجئے۔ سب جانتے ہیں کہ انگریز جنوبی ایران میں وہاں کے باشندوں کی فلاح و بہبود کی خاطر داخل ہوئے تھے۔ لیکن یہ بات مشتبہ ہے کہ اگر جنوبی ایران میں تیل کے وسیع ذخائر موجود نہ ہوتے تو پھر بھی انگریزوں کو ان لوگوں کی فلاح و بہبود سے کوئی دلچسپی ہوتی۔ آج کل بھی امریکی، انگریز اور دوسری بڑی قومیں چھوٹے ملکوں کے ساتھ جو سلوک کر رہی ہیں، ان کی کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں۔

اس میں مبالغہ آرائی کا کوئی پہلو نہیں کہ عہدِ حاضر کی بڑی طاقتوں کا خارجی سرگرمیوں کا مقصد چھوٹے ملکوں کے وسائل پر قبضہ کرنا ہے۔ افراد اس قسم کے کام کریں تو انہیں مجرم سمجھا جاتا ہے اور قانون انہیں سزا بھی دیتا ہے۔ جب قومیں اس قسم کی کارروائیاں کرتی ہیں تو ان کے شہری انہیں قابلِ تعریف خیال کرتے ہیں۔

یہ ساری بحث ہمیں زیرِ نظر باب کے موضوع یعنی سکولوں میں حب الوطنی کی تعلیم و تربیت کی طرف لے آتی ہے۔ اس تعلیم کے بارے میں فیصلہ کرنے کی خاطر ضروری ہے کہ ہم نہ صرف اس کے مقاصد بلکہ حقیقی اثرات کے بارے میں بھی واضح ہوں۔ حب الوطنی، اپنے مقصد کے حوالے سے نیز ان لوگوں کے خیالات میں جو اس کی وکالت کرتے ہیں، زیادہ تر ایک اچھی شے ہے۔ اپنے وطن، اپنی جنم بھومی سے محبت اور اس کے تاریخی کارناموں پر فخر، جس حد تک وہ قابلِ فخر ہوں، کوئی بری بات نہیں ہے۔ اصل میں یہ ایک پیچیدہ جذبہ ہے۔ کچھ تو اس کا تعلق اپنی سرزمین اور اپنے گردوپیش سے محبت پر ہے اور کسی حد تک اسے خاندان کی توسیع شدہ محبت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس جذبے کی جڑیں کچھ تو جغرافیائی ہیں اور کچھ حیاتیاتی۔ تاہم بنیادی طور پر یہ جذبہ نہ تو سیاسی ہے اور نہ ہی معاشی۔ یہ جذبہ اپنے وطن کے لئے ہے اور یہ دوسرے ملکوں کے خلاف نہیں ہے۔ ابتدائی صورت میں یہ جذبہ ان لوگوں کے علاوہ مشکل ہی سے ملتا ہے جو دیہات میں رہتے ہیں اور جنہوں نے سیر و سیاحت کم ہی کی ہوتی ہے۔ دیہی زمیندار یا کسان کے مقابلے میں شہری باشندے

http://muftbooks.blogspot.com/

جو اپنی سکونت عام طور پر تبدیل کرتے رہتے ہیں اور کسی قطعہ اراضی کے مالک نہیں ہوتے، وہ ایسے بنیادی جذبے کے حامل کم ہی ہوتے ہیں جس میں سے حب الوطنی ابھر سکے۔ شہری باشندے اس کے بجائے ایسے احساس کے حامل ہوتے ہیں جو زیادہ تر مصنوعی ہوتا ہے اور عام طور پر ان کی تعلیم اور اخبار بینی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ احساس کم و بیش مکمل طور پر نقصان دہ ہوا کرتا ہے کیونکہ وہ اپنے وطن اور ہم وطنوں کی محبت سے زیادہ غیر ملکیوں کی نفرت اور ان کے ملکوں پر قبضہ کرنے کی خواہش پر مبنی ہوتا ہے۔ تقریباً تمام برے جذبوں کی طرح یہ جذبہ بھی وفاداری کے بھیس میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر آپ کسی شخص سے کوئی قابلِ نفرت جرم کروانا چاہتے ہیں جس سے وہ خوف زدہ ہو کر گریز کرتا ہو تو پھر پہلے آپ اسے پکے مجرموں کے کسی گروہ سے وفاداری کا درس دیتے ہیں اور پھر اس کے جرم کو وفاداری کے وصف کی مثال بنا کر پیش کرتے ہیں۔ حب الوطنی اس عمل کی مکمل ترین مثال ہے۔ جھنڈے کے احترام کی مثال لیجئے۔ جھنڈا قوم کے لئے اس کی فوجی صلاحیت کی علامت ہوتا ہے۔ وہ لڑائی، جنگ، فتح اور بہادری کے کاموں کی یاد دلاتا ہے۔ برطانوی جھنڈا انگریزوں کو شیکسپیئر، نیوٹن یا ڈارون کی یاد نہیں دلاتا بلکہ نیلسن اور ٹرافلگر جیسی چیزوں کی یادیں تازہ کرتا ہے۔ انگریزوں نے انسانی تہذیب کے قافلے کو آگے بڑھانے کے لئے جو کارنامے سر انجام دیئے ہیں وہ اس جھنڈے کی علامت کے تحت وجود میں نہیں آئے تھے۔ لہٰذا اس علامت کا احترام کرتے ہوئے ان کارناموں کی یاد تازہ نہیں ہوتی۔ بات یہ بھی ہے کہ انگریزوں نے بہترین کارنامے انگریزوں کی حیثیت سے نہیں بلکہ افراد کے طور پر سرانجام دیئے ہیں۔ اس کے مقابلے میں انگریزوں نے جو کام انگریز ہونے کی وجہ سے اور انگریز ہونے کے شعور کے ساتھ سرانجام دیئے وہ کمتر نوعیت کے ہیں۔ لیکن جھنڈا ایسے ہی کاموں کی یاد دلاتا ہے اور ان کی تعریف و توصیف کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اب جو بات برطانوی جھنڈے کے معاملے میں درست ہے وہی دوسرے ملکوں کے جھنڈوں پر بھی لاگو ہوتی ہے۔

یورپی مغربی دنیا میں لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ ان کی اہم ترین اجتماعی وفاداری اس ریاست سے ہے جس کے وہ شہری ہیں اور یہ کہ وطن کی طرف سے ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ وہی کچھ کریں جو حکومت انہیں کرنے کے لئے کہتی ہے۔ اس خدشے کے پیشِ نظر کہ نوجوان اس نظریئے کی مخالفت نہ کرنے لگیں، انہیں غلط اور گمراہ

http://muftbooks.blogspot.com/

کن نظریوں، جھوٹی تاریخ، غلط سیاست اور غلط معاشیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ انہیں دوسرے ملکوں کی بداعمالیوں کی داستان سنائی جاتی ہے، لیکن اپنے ملک کی برائیوں پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ ان کے ملک نے ہمیشہ جارحیت کے خلاف دفاعی جنگیں لڑی ہیں۔ یہ جارحیت ہمیشہ غیر ملک کرتے رہے ہیں۔ انہیں یہ درس بھی دیا جاتا ہے کہ اگر کبھی ان کے ملک نے دوسرے ملکوں پر قبضہ کیا بھی ہے تو صرف تہذیب و شائستگی پھیلانے کے لئے، یا پھر ایمان کی روشنی اور ایسے ہی دوسرے شریفانہ مقاصد کے لئے اس نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ نوجوانوں کو یہ اطلاع بھی دی جاتی ہے کہ بیرونی قوموں کا کوئی اخلاقی معیار نہیں ہوتا اور یہ کہ قدرت کا فرض ہے کہ وہ کافروں کو ملیامیٹ کر دے۔ سمجھایا جاتا ہے کہ خدا یہ کام ضرور کرے گا اور بالآخر سارے وحشی اور کافی صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر قوم دوسری قوموں کے ساتھ لین دین میں اس قدر جرائم کا ارتکاب کرتی ہے جس قدر جرائم کو اس کی فوجی قوت ممکن بناتی ہے۔ شہری، یہاں تک کہ شائستہ اور مہذب شہری بھی، ان سرگرمیوں کی پوری تائید وحمایت کرتے ہیں جو ان جرائم کو ممکن بناتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انہیں پتہ ہی نہیں ہوتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ حقائق کو صحیح پسِ منظر میں دیکھ ہی نہیں سکتے۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عام شہری لوٹ مار کی خاطر لاشعوری طور پر قتل و غارت کے جرم میں شریک ہو جاتا ہے۔ اس کی اس مکروہ حرکت پر آمادگی کے لئے زیادہ تر تعلیم کو موردِ الزام ٹھہرانا چاہئے۔ بعض لوگ اس سلسلے میں پریس پر الزام لگاتے ہیں۔ تاہم میرے نزدیک وہ غلطی پر ہیں۔ بات یہ ہے کہ پریس ویسا ہی ہوتا ہے جیسا عوام چاہتے ہیں اور عوام فضول قسم کے اخبارات کے دلدادہ اس لئے ہوتے ہیں کہ ان کی تعلیم و تربیت ہی فضول طریقے سے ہوئی ہوتی ہے۔ قوم پرستانہ طرز کے جذبہ حب الوطنی کی سکولوں میں تدریس کی بجائے طالبِ علموں کو یہ بتانا چاہئے کہ یہ اجتماعی ہسٹریا کی ایک شکل ہے جس کا شکار بدقسمتی سے عام لوگ ہو جاتے ہیں اور جس کے خلاف لوگوں کو ذہنی اور اخلاقی طور پر مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ قوم پرستی ہمارے زمانے کی سب سے زیادہ خطرناک بدی ہے۔ وہ شراب نوشی، منشیات، کاروباری بددیانتی اور ان تمام برائیوں سے

http://muftbooks.blogspot.com/

زیادہ خطرناک ہے جن کی طرف روایتی اخلاقی تعلیم کا رُخ رہا ہے۔ دنیائے جدید کا علم رکھنے والے صاحبان اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ قوم پرستی کے سبب مہذب انداز زندگی کو برقرار رکھنے کا عمل خطرے کی زد میں آ گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بین الاقوامی اُمور سے واقفیت رکھنے والے تمام لوگ اس خطرے سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ اس کے باوجود دنیا بھر میں ہر جگہ عوامی وسائل اس تباہ کن بدی کو پھیلانے اور اس کی شدت میں اضافہ کرنے پر خرچ ہو رہے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ بچوں کو قتل و غارت کا درس دینے کو اچھا نہیں سمجھتے انہیں غدار قرار دیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ فرض کرے کہ والدین کو چونکہ اپنے بچوں سے فطری محبت ہوتی ہے، لہٰذا انہیں اس خیال سے وحشت ہوگی کہ ان کے بچے دکھ درد کی حالت میں مریں۔ لیکن حقیقی صورتِ حال یہ نہیں ہے۔ خطرہ گو یقینی ہے، لیکن اکثر ملکوں میں ارباب اقتدار اس خطرے سے عہدہ برا ہونے کی تمام کوششوں کو شرارت آمیز اور شیطانی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ فوجی ملازمت کو اپنے وطن کے دفاع کے لئے شریفانہ تیاری کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے اور نوجوانوں کو اس امر سے آگاہ کرنے کے لئے ایک لفظ بھی نہیں کہا جاتا کہ اگر ان کا ملک طاقتور ہے تو اس کے فوجی اقدامات ملکی دفاع سے زیادہ بیرونی جارحیت کے لئے ہوں گے۔

حب الوطنی کی تعلیم پر کئی اعتراضات کئے جا سکتے ہیں۔ اس اعتراض کا ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں کہ قوم پرستی کے زہر کو ختم کئے بغیر تہذیب کی بقاء خطرے میں رہے گی۔ اعتراض یہ بھی ہے کہ جس ادارے میں نوجوانوں کو قتل و غارت کی تعلیم دی جاتی ہو، اس میں طرزِ عمل کے مہذب انسانی تصورات کی تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ ایک اور اعتراض یہ ہے کہ نفرت کی تعلیم، جو کہ قوم پرست تعلیم کا لازمی جزو ہے، بذات خود ایک بری شے ہے۔ تاہم ان سب سے بڑھ کر خالص عقلی قسم کا اعتراض یہ ہے کہ قوم پرستی کی تعلیم غلط اور گمراہ کن اُصولوں کی تعلیم کو شاملِ حال رکھتی ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں بچوں کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ ان کا ملک بہترین ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک کے سوا باقی تمام ملکوں میں یہ تعلیم غلط ہے۔ اب چونکہ اقوامِ عالم اس امر پر متفق نہیں ہو سکتیں کہ دنیا کا بہترین ملک کون سا ہے، لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ دوسری قوموں کو پیچھے چھوڑ کر کسی ایک قوم کی خوبیوں پر زور دینے کی عادت ختم کر دی جائے۔ میں اس بات سے آگاہ ہوں کہ یہ تصور کہ بچوں کو وہی کچھ پڑھایا

http://muftbooks.blogspot.com/

جائے جو درست ہو، تخریبی اور بعض صورتوں میں خلافِ قانون بھی قرار پائے گا۔ اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ سچ کی تعلیم جھوٹ کی تعلیم سے بہتر ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کے تمام ملکوں میں ایک جیسی تاریخ پڑھائی جانی چاہئے اور تاریخ کی نصابی کتب بڑے ملکوں کی مدد سے اقوام متحدہ کی طرف سے تیار ہونی چاہئیں۔ تاریخ کو قومی کے بجائے عالمی تاریخ ہونا چاہئے اور اسے جنگوں کے بجائے ثقافتی و تہذیبی اہمیت کے واقعات پر زور دینا چاہئے۔ جنگوں کا ذکر ہو بھی تو صرف فاتحین کے نقطہ نظر سے نہیں ہونا چاہئے۔ نہ ہی دلیرانہ کارناموں پر ساری توجہ دینی چاہئے۔ اس کے بجائے طلبہ کو جنگوں کی تباہ کاریوں اور ان سے پیدا ہونے والے انسانی مصائب سے روشناس کروانا چاہئے۔ جنگ کی صورت میں جو ظلم و تشدد اور بے انصافی پروان چڑھتی ہے، اس پر خاص توجہ دینی چاہئے۔ اس وقت تاریخ کی صورتحال یہ ہے کہ بس جنگوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے۔ سکولوں کی تعلیم کے مقابلے میں امن پسندوں کی کاوشیں بے اثر ہو کر رہ گئی ہیں۔ بلاشبہ یہ بات امیر لوگوں کے سکولوں کے بارے میں زیادہ درست ہے جو ہر جگہ اخلاقی اور ذہنی طور پر غریبوں کے مدرسوں سے زیادہ پسماندہ ہیں۔

سکولوں میں بچے دوسری قوموں کی خامیوں اور کوتاہیوں کے بارے میں تو علم حاصل کرتے ہیں، لیکن اپنی قوم کے نقائص کے بارے میں انہیں بے خبر رکھا جاتا ہے۔ اس قسم کی تاریخی تعلیم راہ حق پر ہونے کی خود فریبی اور جنگجو احساسات پیدا کرتی ہے۔ اس کے برعکس اپنی قوم کی خرابیوں سے آگاہی فائدہ بخش ثابت ہوتی ہے۔ اپنی قومی تاریخ کے سیاہ پہلوؤں سے بے خبری کی بناء پر ہر مہذب ملک کا عام شہری خود فریبی میں ڈوبا رہتا ہے۔ وہ دوسری قوموں کے بارے میں وہ سب کچھ جانتا ہے جو وہ خود نہیں جانتے۔ لیکن غیر لوگ اس کے ملک کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں، وہ خود اس سے لاعلم رہتا ہے۔

حب الوطنی کی تعلیم کا بڑا حصہ عقلی لحاظ سے گمراہ کن ہوتے ہوئے بھی اخلاقی اعتبار سے بے ضرر ہے۔ بات یہ ہے کہ جو پڑھانے والے ہیں، ان کی اپنی تعلیم بھی غلط نظام کے تحت ہوئی ہوتی ہے۔ ان کو یہ محسوس کرنے کی عادت ہو چکی ہے کہ ایک ایسی دنیا میں جہاں ساری غیر قومیں بدطینت ہیں، اپنے وطن کو تباہی سے بچانے کے لئے عظیم الشان فوجی تیاریاں ضروری ہیں۔ ملک کی محبت کے پراپیگنڈہ کا یا کم بے ضرر پہلو بھی ہے۔ بعض

http://muftbooks.blogspot.com/

مفادات ایسے ہیں جو اس قسم کے پروپیگنڈے کے ذریعے دولت کماتے ہیں۔ اس طرح کے مفادات صرف ہتھیار بنانے والوں کے ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کے بھی ہیں جنہوں نے غیر ترقی یافتہ ملکوں میں سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ اس کی مثال یوں لیجئے کہ اگر آپ کسی قدر بدنظمی کے شکار ملک میں تیل کے مالک ہیں تو پھر تیل نکالنے کے اخراجات دو حصوں پر مشتمل ہوں گے..... اول تو تکنیکی یعنی تیل نکالنے کے اخراجات اور دوسرے سیاسی یا فوجی اخراجات جو مقامی لوگوں کو قابو میں رکھنے پر خرچ ہوں گے۔ ان اخراجات کا صرف پہلا حصہ ہی آپ کو برداشت کرنا ہوگا۔ دوسرا حصہ پہلے سے کہیں زیادہ ہوسکتا ہے۔ اس کا بوجھ ٹیکس دہندگان کے کندھوں پر پڑتا ہے اور انہیں وطن کی محبت کے پراپیگنڈہ کے ذریعے یہ بوجھ برداشت کرنے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ اس طریقے سے حب الوطنی اور مالیات کے درمیان ایک انتہائی ناپسندیہ تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے نوجوانوں کو احتیاط کے ساتھ بے خبر رکھا جاتا ہے۔

حب الوطنی کی زیادہ انتہا پسند صورتوں کا روپے پیسے کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ملک کی مسلح افواج اس کے شہریوں کی دولت میں اضافہ کرنے کے لئے استعمال کی جا سکتی ہیں اور کی بھی جاتی ہیں۔ یہ کام کسی حد تک تاوان اور خراج کی وصولی کے ذریعے ہوتا ہے اور کسی حد تک ایسے قرضوں کی ادائیگی پر مجبور کر کے جو بصورت دیگر ادا نہ ہو سکتے ہوں۔ اسی طرح خام مال پر قبضہ کر کے اور جبری تجارتی معاہدوں کے ذریعے بھی یہ کام کیا جاتا ہے۔ اب اگر اس سارے عمل پر جذبہ حب الوطنی کی شان و شوکت کا ملمع نہ چڑھایا جائے تو اس کی برائیاں اور خامیاں تمام ہوش مند لوگ پر عیاں ہو جائیں۔

لوگ چاہیں تو تعلیم آسانی سے نسل انسانی کی یکجہتی کا احساس پیدا کر سکتی ہے۔ اس طرح وہ بین الاقوامی تعاون کی اہمیت کا احساس بھی دلا سکتی ہے۔ یوں ایک نسل کے اندر اس فساد انگیز قوم پرستی کو ختم کیا جا سکتا ہے جس نے دنیا کو مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اسی طرح ایک نسل کے اندر اندر محصولات کی وہ دیواریں گرائی جا سکتی ہیں جو ہمیں غریب بنا دیتی ہیں۔ اس اسلحہ بندی کو ختم کیا جا سکتا ہے جو ہمیں موت اور تباہی کے خطرے سے دوچار کر رہی ہے اور اس نفرت کی جگہ دوستانہ جذبات پیدا کئے جا سکتے ہیں جس سے ہم خود اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں۔ قوم پرستی کا جو جذبہ چاروں طرف طوفان بدتمیزی برپا کر

http://muftbooks.blogspot.com/

رہا ہے، زیادہ تر مدرسوں کی پیداوار ہے۔ اب اگر اسے ختم کرنا مقصود ہے تو تعلیم میں ایک نئی روح پھونکنا ہوگی۔

اسلحہ بندی کے خاتمے کی طرح اس معاملے کو بھی بین الاقوامی معاہدے کے ذریعے حل کرنا ہوگا۔ اقوامِ متحدہ کو اگر حملہ آوروں کی لیپا پوتی سے فرصت ملے تو شاید اسے جلد یا بدیر اس معاملے کی اہمیت کا احساس بھی ہو جائے گا۔ شاید حکومتیں تاریخ کی یکساں تدریس پر متفق ہوسکتی ہیں۔ شاید اگلی جنگ عظیم کے بعد بھی بعض قومیں بچ جائیں تو وہ اپنے اپنے قومی جھنڈوں کی جگہ اقوام متحدہ کے جھنڈے کے لئے خالی کرنے پر رضامند ہو جائیں۔ خیر اس میں شک نہیں کہ ابھی یہ خواب وخیال کی باتیں ہیں۔ اساتذہ کی فطرت یہ ہے کہ جو تھوڑا بہت وہ جانتے ہیں، وہی کچھ پڑھا دیتے ہیں۔ اب ذرا فرض کیجئے کہ تاریخ کے انگریز اساتذہ بین الاقوامی معاہدے کے تحت عالمی تاریخ پڑھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تب ان کو سن ہجری کی تاریخ اور قسطنطنیہ کی شکست کی تاریخ بھی تلاش کرنی پڑے گی۔ انہیں چنگیز خان اور ایوان جابر کے بارے میں علم حاصل کرنا ہوگا۔ انہیں یہ بھی جاننا ہوگا کہ یونانیوں نے پہلے پہل کب مہاتما بدھ کے مجسمے بنانے شروع کئے تھے۔ جب ان کے وقت پر یہ سب مطالبات کئے جائیں گے تو ان کے غصے کی کوئی حد نہ رہے گی۔ وہ ایسی حکومت کا مطالبہ کرنے لگیں گے جو اقوام متحدہ کی خلاف ورزی کا وعدہ کرے۔ ہمارے زمانے میں پوری مغربی دنیا کی توانائی سرمایہ دارانہ مہموں پر صرف ہو رہی ہے۔ مجموعی طور پر یہ تباہی کی طرف لے جانے والی قوت ہے۔ دوسری طرف حالت یہ ہے کہ انسانوں کے وہ گروہ جو کوئی اچھا کام کر سکتے ہیں، جیسے مثلاً اساتذہ کرام، وہ زیادہ تر موجودہ حالات پر ہی قانع ہیں۔ سماجی اصلاح کی ہر کوشش چونکہ ان کے اسباق میں تبدیلی کا تقاضہ کرتی ہے۔ لہٰذا ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اصلاح کے ہر قدم میں رکاوٹ ڈالی جائے۔ جس کوشش اور تگ ودو سے وہ دامن چھڑانا چاہتے ہیں، وہ نہ صرف عقلی بلکہ جذباتی نوعیت کی حامل بھی ہوتی ہے۔ جانے پہچانے جذبے آسانی سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جب کہ معمول کے مواقع، جیسے مثلاً قومی ترانہ گائے جانے کا وقت، پر نئے جذبوں کو محسوس کرنے کی خود کو عادت ڈالنا دشوار ہوتا ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری جدید دنیا، جس میں اچھے لوگ سستی و کاہلی کا شکار ہیں اور برے لوگ سرگرم کار ہیں، بدمستی کے سے عالم میں تباہی کے

http://muftbooks.blogspot.com/

غار کی طرف لڑھکتی جا رہی ہے۔ چند لمحے ایسے آتے ہیں کہ جب انسان تباہی کے اس غار کو دیکھ لیتے ہیں، لیکن غیر حقیقی جذبوں کا خمار جلد ہی ان کی آنکھیں بند کر دیتا ہے۔ اور جو لوگ اس نشے سے محفوظ ہیں، ان کے لئے خطرہ بالکل واضح ہے۔ ہماری تہذیب کو تباہی کے غار کی طرف دھکیلنے میں سب سے بڑا کردار قوم پرستی کا جذبہ ادا کر رہا ہے۔

❁❁❁

http://muftbooks.blogspot.com/

گیارہواں باب

تعلیم میں مقابلے کا تصور

انیسویں صدی کے غالب نصب العینوں میں سے کچھ تو ختم ہو چکے ہیں اور کچھ ہمارے زمانے تک برقرار ہیں۔ برقرار رہنے والے نصب العینوں میں سے اکثر کا ہماری آج کی زندگی میں عمل دخل ایک صدی پہلے کے مقابلے میں بہت محدود ہو گیا ہے۔ مقابلے کا نصب العین اس سلسلے کی ایک عمدہ مثال ہے۔ میرے خیال میں مقابلے کے تصور میں یقین کو ڈارون کے نظریئے سے منسوب کرنا غلط ہے۔ اصل میں حقیقت اس کے برعکس ہے۔ مقابلے میں یقین نے ڈارون کے نظریئے کو جنم دیا تھا۔ جدید ماہرین حیاتیات ارتقاء میں تو یقین رکھتے ہیں لیکن ارتقاء کی قوت محرکہ کے طور پر وہ ڈارون کے مقابلے میں مسابقت کو بہت کم اہمیت دیتے ہیں۔ یہ تبدیلی اصل میں اس تبدیلی کی عکاسی کرتی ہے جو معاشرے کے معاشی ڈھانچے میں رونما ہوئی ہے۔

صنعتی زمانے کا آغاز ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے والے چھوٹے چھوٹے اداروں سے ہوا تھا۔ شروع میں ان اداروں کو ریاست کی طرف سے بہت کم مدد ملتی تھی۔ اس زمانے میں ریاست ابھی تک زرعی اور اشرافی نوعیت کی حامل تھی۔ لہٰذا ابتدائی دور کے صنعت کار اپنی مدد آپ، حکومت کی طرف سے عدم مداخلت اور مقابلے کے قائل تھے۔ مسابقت کا تصور صنعتی ادارے سے دوسرے حلقوں تک پھیل گیا۔ ڈارون نے عوام کو یہ یقین دلایا کہ زندگی کی مختلف صورتوں کے درمیان مقابلہ ارتقائی پیش رفت کا سبب ہے۔ ماہرین تعلیم بھی یہ یقین کرنے لگے کہ طالبِ علموں میں محنت و مشقت کو فروغ دینے کے لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان میں مقابلے کو رواج دیا جائے۔ آجروں نے آزاد مقابلے میں عقیدے کو ٹریڈ یونین کی جدوجہد کے خلاف دلیل کے طور پر استعمال کیا۔ امریکہ کے

http://muftbooks.blogspot.com/

پسماندہ علاقوں میں اب بھی اسے اس طور استعمال کیا جاتا ہے۔ تاہم خود سرمایہ داروں کے درمیان مقابلہ رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔ صنعتوں کو قومی سطح پر متحد کرنے کا رجحان بڑھتا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ زیادہ تر مقابلہ کسی ایک قوم کے مختلف سرمایہ داروں میں نہیں رہا بلکہ اس نے مختلف قوموں کے درمیان مقابلے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ سرمایہ داروں کی فطری خواہش یہ رہی کہ اگرچہ وہ آپس میں متحد ہوتے جائیں، لیکن ان کے محنت کشوں میں اتحاد پیدا نہ ہو۔ ان کا اُصول یہ رہا ہے کہ ''اکٹھے ہو کر ہم کامیاب ہوں گے اور مزدور تقسیم ہو کر ناکام رہیں گے'' لہٰذا بڑے بڑے صنعت کاروں کی سرگرمیوں کے دائرے سے باہر زندگی کے ہر شعبے میں مقابلے کو عظیم نصب العین کی حیثیت سے برقرار رکھا گیا ہے۔ جہاں تک بڑے سرمایہ داروں کا تعلق ہے، مقابلہ ان کے لئے قومی ہے۔ اس لئے وہ حب الوطنی کے جذبے کو فروغ دینے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

تعلیم کے شعبے میں مقابلے کے نصب العین نے دو قسم کی خرابیاں پیدا کی ہیں۔ ایک طرف تو اس نے زندگی کے مختلف شعبوں اور خاص طور پر بین الاقوامی اُمور میں تعاون و اشتراک کے بجائے مقابلے کا احترام کرنے کا درس دیا ہے۔ دوسری طرف اس نے کلاس روم ہیں، نیز وظائف حاصل کرنے اور بعد ازاں روزگار کی تلاش میں مقابلے کے ایک وسیع نظام کا جال بچھا دیا ہے۔ جہاں تک روزگار کی تلاش کا معاملہ ہے، ٹریڈ یونین جدوجہد نے محنت کشوں کی حد تک مقابلے کی سختی کو قدرے کم کر دیا ہے۔ تاہم پیشہ ور افراد کے لئے اس کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

تعلیم کے شعبے میں مقابلے کے تصور نے سب سے بڑی خرابی یہ پیدا کی ہے کہ خاص طور پر بہترین طلبہ ضرورت سے زیادہ تعلیم پر مائل ہو گئے ہیں۔ شمالی اور جنوبی امریکہ میں تو نہیں البتہ مغربی یورپ کے تمام ملکوں میں فی زمانہ ایک خطرناک رجحان یہ ہے کہ نوجوانوں پر تعلیم کو بوجھ اس قدر لاد دیا جائے کہ نہ صرف ان کی قوت تخیل اور ذہانت بلکہ جسمانی صحت پر بھی برا اثر پڑنے لگتا ہے۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ زیادہ ہوشیار بچے ہی اس رجحان سے زیادہ نقصان اُٹھاتے ہیں۔ ہر نسل کے بہترین دماغ اور بہترین تخیل مقابلے کے عظیم دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیئے جاتے ہیں۔ میری طرح جس کسی کو بھی یونیورسٹی میں ایک نسل کے بہترین دماغوں سے میل جول کا تجربہ ہوا ہے، وہ یہ جان سکتا

http://muftbooks.blogspot.com/

ہے کہ بچپن میں حد سے زیادہ دباؤ ڈالنے سے پہنچنے والا ہولناک ہوتا ہے۔ امریکہ کا تعلیمی نظام مغربی یورپ کے مقابلے میں کئی حوالوں سے کمتر ہے۔ لیکن اس معاملے میں امریکیوں کی صورت حال بہتر ہے۔ یونیورسٹیوں سے فارغ ہونے والے نوجوان قابل امریکی شاذونادر ہی تہذیب کی اس ہمہ گیری اور خالص علم سے بہرہ ور ہوتے ہیں جو کہ یورپ کے تعلیم یافتہ طبقے کا خاصہ ہے۔ تاہم ان میں علم کے لئے محبت، تحقیق کی تڑپ اور عقلی پیش قدمی کی ایسی تازگی پائی جاتی ہے جس کی جگہ یورپ میں ہمیں ایک بے زار کرنے والی اور افسردہ درستگی نظر آتی ہے۔ علم کی محبت سے محروم ہوئے بغیر علم حاصل کرنا دشوار ہے اور یورپ کے ماہرین تعلیم اس مشکل کا کوئی حل نہیں ڈھونڈ سکے ہیں۔

ایک اوسط درجے کا استاد سب سے پہلے نوجوانوں کے تخیل کو ملیامیٹ کرنے کا کام شروع کرتا ہے۔ تخیل ایک سرکش، غیر منظّم انفرادی اور اس قسم کی قوت ہے جس پر درستگی یا غیر کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ان تمام حوالوں سے تخیل استاد کے لئے پریشان کن ہوتا ہے۔ اس کی پریشانی اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب مسابقت کڑی درجہ بندی کا تقاضا کرتی ہو۔ تخیل کے صحیح برتاؤ کا مسئلہ کچھ اس وجہ سے اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ اکثر بچوں کی حقیقی دنیا میں دلچسپی جب زیادہ ہوتی ہے تو تخیل خود بخود زوال پذیر ہو جاتا ہے۔ جن بالغوں میں قوت متخیلہ مضبوط رہتی ہے اصل میں وہی ہوتے ہیں جو لڑکپن ہی سے اسے حقیقت کی دنیا کے اثر سے آزاد رکھتے ہیں۔ بہرطور اگر بالغ تخیل کو قابلِ قدر ہونا ہے تو پھر حقیقت سے اس کی نجات کو جہالت کے بجائے غلامانہ رویوں کے فقدان سے جنم لینا چاہئے۔

زیادہ ٹھوس اُمور تک رسائی کے لئے بچوں کی ڈرائنگ اور تصویر کشی جیسے معاملے ہی کو لیجئے۔ پانچ سے آٹھ برس تک کی عمر کے اکثر بچوں کی اگر حوصلہ افزائی کی جائے اور انہیں آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ تصویری انداز کے تخیل کا کافی حد تک ثبوت دیتے ہیں۔ بعض بچے، جن کی تعداد بہت کم ہوا کرتی ہے، خود تنقیدی کی صلاحیت پیدا ہونے کے بعد بھی تصویر کشی کی خواہش کو برقرار رکھتے ہیں لیکن اگر ان پر یہ زور دیا جاتا رہے کہ وہ احتیاط سے نقل بنائیں اور درست منظر کشی کریں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا رویہ بتدریج فنی کے بجائے سائنسی ہوتا چلا جاتا ہے اور ان کی تصویریں تخیل کی کسی کارفرمائی کی عکاسی نہیں

http://muftbooks.blogspot.com/

کرتیں۔ اگر اس صورتحال سے بچنا مقصود ہے تو جب تک بچے خود نہ پوچھیں، انہیں یہ نہیں بتلاتے رہنا چاہئے کہ وہ تصویر صحیح اور حقیقت کے مطابق بنائیں۔ مزید برآں انہیں یہ سوچنے کا موقع بھی نہ دینا چاہئے کہ درستگی کوئی خوبی ہے۔ استاد کے لئے یہ ایک مشکل بات ہے کیونکہ فنی کمال رائے اور انفرادی ذوق کا معاملہ ہے جب کہ درستی کی معروضی طور پر جانچ کی جاسکتی ہے۔ جب تک استاد غیر معمولی استعداد کا مالک نہ ہو، سکول کی تعلیم کا سماجی عنصر اور کسی جماعت کا رکن ہونے کی حقیقت ایسی خوبی پیدا کرنے کا میلان رکھتی ہے جس کا دارومدار ذاتی خوبی کے بجائے سماجی طور پر قابل توثیق خوبیوں پر ہو۔ ذاتی خوبی کے تحفظ کے لئے تدریس کو کم از کم رکھنا ضروری ہے۔ علاوہ یہ بات بھی ضروری ہوتی ہے کہ تنقید کو اس حد تک نہ بڑھا دیا جائے کہ وہ ذات کے اظہار میں بزدلی پیدا کر دے۔ تاہم ان اُصولوں کی روشنی میں کوئی ایسا کام کرنا دشوار ہی ہے جو تعلیمی حکام کو پسند آسکے۔

قدرے بعد کے مرحلے پر اسی شے کا اطلاق ادب کی تعلیم پر بھی ہوتا ہے۔ اساتذہ کرام بہت زیادہ پڑھانے کا رجحان رکھتے ہیں اور وہ اس قسم کے احمقانہ اُصول بھی بناتے رہتے ہیں کہ کوئی جملہ ''اور'' یا ''لیکن'' سے شروع نہ ہونا چاہئے۔ بلاشبہ گرامر کے طے شدہ اُصولوں کا خیال رکھنا چاہئے لیکن سچی بات یہ ہے کہ گرامر میں اس سے زیادہ لچک موجود ہے جتنی کہ اکثر استاد فرض کرتے ہیں۔

مصوری کی طرح ادب کے معاملے میں بھی خطرہ یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ فنی کمال کی جگہ درستی کو مل جائے۔ ادب کی تدریس صرف مطالعے تک محدود ہونی چاہئے اور مطالعے میں وسعت کی بجائے گہرائی ہونی چاہئے۔ ایسی چیزوں کو زبانی یاد کر لینا اچھا ہے جن سے بے ساختہ خوشی حاصل ہو۔ ادبی تعلیم کے نقطہ نظر سے کسی ایسی چیز کو پڑھنا فضول ہے، چاہے وہ کتنی ہی کلاسیکی کیوں نہ ہو، جو پڑھنے والے کو حقیقی لطف عطا نہیں کرتی۔ جو ادب شوق سے پڑھا جائے اور اچھی طرح سمجھا جائے وہ الفاظ کے انتخاب اور اسلوب تحریر پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جبکہ سرسری پڑھا جانے والا ادب مصنوعی دانش ورانہ گفتگو کو فروغ دیتا ہے۔ بلاشبہ طلبہ کو لکھنا بھی چاہئے اور پڑھنا بھی، لیکن استاد کو ان کی تحریر پر تنقید نہیں کرنی چاہئے اور نہ ہی انہیں یہ جتلانا چاہئے کہ اس کے خیال میں وہ کس طرح بہتر لکھ سکتے تھے۔ جہاں تک لکھنے کا تعلق ہے، درس وتدریس کا کوئی کام نہ ہونا چاہئے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

تخیل سے ذہانت کی طرف بڑھتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ اسی قسم کے خیالات یہاں بھی برمحل ہیں۔ یہ بات تھکن کے بارے میں بھی درست ہے۔ تھکن عام ہوسکتی ہے اور خاص بھی۔ عام تھکن پر توجہ صحت کے ضمن میں دینی چاہئے۔ البتہ ذہنی تربیت سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں کو خاص تھکن کے معاملہ کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہئے۔ ہمارے قارئین کو روسی ماہر نفسیات پاولوف کا کتا تو یاد ہوگا جس نے بیضوی شکل کو دائرے سے ممتاز کرنا سیکھ لیا تھا۔ لیکن پاف لوف بیضوی اشکال کو بتدریج دائرے کے قریب تر لاتا گیا۔ یہاں تک کہ آخری مرحلہ آ گیا جہاں بڑے اور چھوٹے محور میں آٹھ اور نو کی نسبت رہ گئی۔ اس مقام پر کتے کی امتیاز کرنے کی قوت ختم ہوگئی اور ساتھ ہی اس نے دائروں اور بیضوی شکلوں کے بارے میں سیکھے ہوئے پچھلے سارے سبق بھی بھلا دیئے۔

سکول میں اکثر بچوں اور بچیوں کے ساتھ یہی واقعہ پیش آتا ہے۔ اگر انہیں ایسے مسائل حل کرنے پر مجبور کیا جائے جو یقینی طور پر ان کی صلاحیت سے بالاتر ہوتے ہیں تو پھر ایک قسم کی پریشان کن دہشت ان کو گرفت میں لے لیتی ہے۔ یوں بچے نہ صرف موجودہ مسائل سے گھبرانے لگتے ہیں بلکہ ذہنی لحاظ سے متعلقہ موضوعات بھی ان کی گرفت سے نکل جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ محض اس لئے زندگی بھر ریاضی کے مضامین بھی پھسڈی رہتے ہیں کہ ان مضامین میں ان کی تربیت بہت چھوٹی عمر میں شروع ہو جاتی ہے۔ سکول میں بچے کی جن صلاحیتوں کو آزمایا جاتا ہے، ان میں سے تجریدی استدلال کی صلاحیت سب سے آخر میں ترقی پاتی ہے۔ ماہرِ نفسیات پیاژے نے اپنی قابلِ قدر کتاب ''بچے کی قوت فیصلہ و استدلال'' میں جو اعداد و شمار فراہم کئے ہیں، ان سے اس خیال کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ جب تک کوئی استاد نفسیاتی بصیرت اور تجربے کا مالک نہ ہو وہ یہ نہیں جان سکتا کہ بچے کا ذہن بڑی حد تک گڈمڈ ہوتا ہے۔ جب تک درست لفظی جواب ملتا رہے، یہ فرض کیا جاتا ہے کہ بچہ سوال کو سمجھ رہا ہے۔ حساب اور ریاضی کے مضامین عام طور پر بہت ابتدائی عمر میں سیکھے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے معاملے میں اکثر طالبِ علم کند ذہن رہ جاتے ہیں۔ اس قسم کی بدبختی سے محفوظ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ استاد نفسیات کا کسی قدر علم، تدریس کے فن میں کافی حد تک تربیت اور اس معاملے میں آزادی کا حامل ہو کہ وہ ضرورت پڑنے پر نصاب میں لچک پیدا کر سکے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ

http://muftbooks.blogspot.com/

غریبوں کو پڑھنانے والے استادوں میں تو پڑھانے کے فن میں مہارت کو پسندیدہ خیال کیا جاتا ہے، جب کہ ''شرفا'' کے بچوں کو ابھی تک غیر تربیت یافتہ استاد ہی پڑھاتے ہیں۔ یہ امارت پرستی کے ناقابلِ پیش گوئی نتائج میں سے ایک ہے۔

تھکن ذہانت کے حقیقی میعار کو نقصان پہنچاتی ہے۔ لہٰذا یہ ایک خطرناک چیز ہے۔ ذہنی اُمور میں دلچسپی کی حوصلہ شکنی اگرچہ بہت زیادہ نقصان دہ ہے لیکن تھکن سے کم تباہ کن ہے۔ یہ حوصلہ شکنی اس واقعہ سے پیدا ہوتی ہے کہ جو کچھ پڑھایا جاتا ہو وہ مکمل طور پر بے فائدہ ہوتا ہے (یا کم از کم محسوس یہی ہوتا ہے) مثال کے لئے سولڑکوں کی کوئی عام سی جماعت لے لیجئے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ ان میں نوے صرف سزا کے ڈر سے پڑھتے ہیں۔ نو کامیابی کے لئے مسابقت کی خواہش کے تحت اور صرف ایک علم سے محبت کی خاطر پڑھتا ہے۔ یہ افسوسناک صورتحال ناگزیر نہیں ہے۔ پڑھائی کے اوقات کم کر کے، اسباق کو رضا کارانہ بنا کر اچھی تدریس کے ذریعے ستر فیصد طلبہ کو علم کی محبت کے حوالے سے پڑھنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ جب اس محرک کو بروئے کار لایا جائے تو بچے کی توجہ خود بخود کسی دباؤ کے بغیر پڑھنے لکھنے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تھکن بڑی حد تک ختم ہو جاتی ہے اور قوت حافظہ بڑی حد تک بہتر ہو جاتی ہے۔ علم کے حصول میں خوش محسوس ہونے لگتی ہے۔ یوں رسمی پڑھائی کے بعد بھی علم حاصل کرنے کے عمل کے جاری رہنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ شوق سے پڑھا جائے تو تھوڑے وقت میں اس سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے جتنا کہ مجبوری اور بوریت کے ماحول میں زیادہ وقت تک پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ تاہم استاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے درس و تدریس کو اس قابل بنائیں کہ وہ اس کے شاگردوں کے نزدیک اہم اور بامعنی ہو جائے۔ یہ نہ ہونا چاہئے کہ دھونس کے ذریعے شاگردوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی جائے کہ جو کچھ استاد پڑھا رہا ہے وہ بہت اہم ہے۔

یونیورسٹی تعلیم کے سوا ہر قسم کی تعلیم کا ایک اور عقلی نقص یہ بھی ہے کہ وہ اطاعت کے جذبے کو پروان چڑھانے کے ساتھ ساتھ اس یقین کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہے کہ جائز طور پر بحث طلب مسائل کے معین جواب موجود ہیں۔ یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آیا ہے کہ ہم چند دوست اس امر پر بحث کر رہے تھے کہ شیکسپیئر کا بہترین ڈرامہ کون سا ہے۔ ہم

http://muftbooks.blogspot.com/

میں سے اکثر غیر رسمی آرا کے حق میں دلائل پیش کر رہے تھے۔ اس موقع پر حال ہی میں یونیورسٹی میں آنے والے ایک ہوشیار نوجوان نے ہمیں وثوق سے بتایا کہ ہیملٹ شیکسپیئر کا بہترین ڈرامہ ہے۔ یہ اس قدر گھسی پٹی بات تھی کہ بحث جاری نہ رہ سکی۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ امریکہ کا ہر پادری جانتا ہے کہ روم کے زوال کے اسباب کیا تھے۔ آپ اس سے یہ سوال کریں تو وہ فوراً اہلِ روم کے اخلاقی زوال کا ذکر چھیڑ دے گا لیکن اس قسم کے لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں یا اس سے بے خبر ہی رہتے ہیں کہ روم کے مغربی سلطنت کے زوال سے دو صدیاں پہلے لوگوں کے اخلاق مثالی بن چکے تھے۔ انگریز بچوں کو انقلاب فرانس کے ایک پہلو کی تعلیم دی جاتی ہے اور فرانسیسی بچے اس انقلاب کے ایک دوسرے پہلو کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان دونوں میں سے درست کوئی بھی نہیں۔ تاہم ان دونوں صورتوں میں استاد سے اختلاف کی جرات کو انتہائی بدتمیزی سمجھا جاتا ہے اور اس کا میلان بھی کم لوگوں ہی میں ہوتا ہے۔ استادوں کو چاہئے کہ وہ اپنے شاگردوں میں عقلی اختلاف کی حوصلہ افزائی کریں بلکہ انہیں شاگردوں کو ایسی کتابیں پڑھنے پر راغب کرنا چاہئے جو استاد کی رائے سے مختلف نقطہ نظر کو پیش کرتی ہیں۔ لیکن ایسا کم ہی کیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم نوجوانوں میں تحقیقی روح پھونکنے کے بجائے ان کے دل و دماغ بے بنیاد عقیدوں سے بھر دیتی ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ نتائج صرف استاد کی کسی کوتاہی سے پیدا ہوں۔ اس میں اس نصاب کا بھی حصہ ہے جو ظاہری علم پر بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ اس سے جلد بازی اور ناموزوں قطعیت کی ضرورت بھی پیدا ہوتی ہے۔

ضرورت سے زیادہ تعلیم کی سب سے بڑی خرابی صحت اور خصوصاً ذہنی صحت پر پڑنے والا اس کا برا اثر ہے۔ انگلستان میں اس خرابی کا سبب لبرل فلسفے کے ماننے کا یہ نعرہ ہے کہ سب لوگوں کو یکساں مواقع مہیا ہونے چاہئیں۔ ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ تعلیم کو صرف خوشحال لوگوں کی اولاد کا امتیازی حق تصور کیا جاتا تھا۔ تاہم بجا طور پر جمہوریت کے زیرِ اثر یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ان تمام لوگوں کی رسائی اعلیٰ تعلیم تک ہونی چاہئے جو اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اب جہاں تک اعلیٰ تعلیم سے فائدہ اُٹھانے کی صلاحیت کا تعلق ہے اس کا دارومدار زیادہ تر ذہنی اہلیت پر ہوتا ہے۔ حل اس کا یہ تلاش کیا گیا کہ بچپن میں تعلیمی صلاحیت اور بہت بڑی حد تک مقابلے کے امتحانات کی بنیاد پر بڑی تعداد میں تعلیمی

http://muftbooks.blogspot.com/

وظائف دیئے جائیں۔ مقابلے کی اعلیٰ خوبیوں پر جو اعتقاد تھا، اس نے لوگوں کو یہ سوچنے سے باز رکھا کہ بچوں پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہئے۔ مقابلے کا بوجھ اگر صرف ذہنی ہوتا تو بھی ناگوار تھا لیکن اس میں تو جذباتی دباؤ بھی شامل ہوتا ہے۔ مقابلے کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی بچے کا نہ صرف معاشی بلکہ سماجی مستقبل بھی طویل تیاری کے بعد مختصر امتحان میں کامیابی پر منحصر ہو کر رہ گیا ہے۔ کسی غریب گھرانے کے ذہین لڑکے کی مثال پر غور کیجئے جس کی دلچسپیاں سب کی سب عقلی ہیں لیکن جس کے ساتھی لکھنے پڑھنے کا کوئی شوق نہیں رکھتے۔ اگر وہ یونیورسٹی تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو ہم مزاج دوست تلاش کرنے اور اپنی پسند کے کام میں زندگی بسر کرنے کی اُمید کر سکتے ہیں۔ لیکن ایسا نہ ہو تو پھر اس کا مقدر یہ رہ جاتا ہے کہ افلاس اور ذہنی تنہائی کے عالم میں زندگی کے دن گزار دے۔ اس متبادل صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کم و بیش یقینی طور پر مضطرب انداز میں اور غیر دانش مندانہ طریقے سے محنت کرے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تعلیم مکمل کرنے سے پہلے ہی اپنی ذہنی لچک گنوا بیٹھے گا۔

وہ تمام صاحبان اس نقص سے آگاہ ہیں جن کو کسی یونیورسٹی میں پڑھانے کا موقع ملا ہے۔ تاہم اس کا حل تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔ غالباً یہ بات ناپسندیدہ ہے اور مالی لحاظ سے تو یقیناً ناممکن ہے کہ ہر شخص کو یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم دی جائے۔ لہٰذا انتخاب کا کوئی طریقہ کار ہونا ضروری ہے۔ اس طریقہ کار کو لازماً زیادہ تر ذہنی صلاحیتوں پر مبنی ہونا چاہئے۔ اچھی بات یہ ہوگی کہ طلبہ پر وہ شدید دباؤ نہ رہے جو امتحانات کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے بجائے اساتذہ کو اپنے عمومی تاثر کی بنیاد پر یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنے شاگردوں میں سے چند کو منتخب کرنا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس طریقے کو استعمال کرنے سے چاپلوسی اور اپنی پسند کے افراد کو نوازنے کا سلسلہ بھی کسی حد تک شروع ہو جائے گا لیکن میرا خیال یہ ہے کہ یہ قباحتیں موجودہ نظام کی خرابیوں کے مقابلے میں کم نقصان دہ ہوں گی۔ بہتر یہ ہوگا کہ یونیورسٹی تعلیم کے لئے چناؤ بارہ برس کی عمر ہی میں کر لیا جائے۔ اس کے بعد منتخب ہونے والے نوجوانوں کو مسابقت سے دور رکھنا چاہئے۔ یہ بھی ہے کہ بارہ برس کی عمر میں ان کا چناؤ مہارت کے بجائے ذہانت کی اساس پر ہونا چاہئے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

ذہانت کی آزمائشوں میں خوبی ہے۔ انگلستان میں ان آزمائشوں کو بہت ہی کم استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس امریکہ میں ان کا استعمال اس قدر زیادہ ہے کہ میرے خیال میں اس کا سائنسی جواز موجود نہیں۔ ان آزمائشوں کی خوبی یہ نہیں کہ ان میں کوئی خطا نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوئی آزمائش نہیں ہوسکتی جس میں کوئی غلطی نہ ہو۔ خوبی کی بات تو یہ ہے کہ ذہانت کی آزمائشیں مجموعی طور پر کم وبیش درست نتائج پیدا کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے لئے عام قسم کے امتحانات کی طرح تھکا دینے والی اور اعصاب شکن تیاری کی ضرورت نہیں ہوتی۔

شہری علاقوں میں اور گنجان آبادی والے دوسرے علاقوں میں بہت زیادہ ہوشیار لڑکوں اور لڑکیوں کی طرح ویسے ہی خصوصی مدرسے ہونے چاہئیں جیسے کہ ذہنی طور پر معذور بچوں کے لئے ہوتے ہیں۔ امریکہ میں اس کام کی ابتدا ہوئی ہے۔ تاہم وہاں ابھی یہ سلسلہ بہت محدود ہے۔

بعض نتائج دلچسپ ہیں۔ مثلاً ایک لڑکے کی ذہنی آئی کیو (IQ) 190 تھی جبکہ اوسط حاصل تقسیم 100 تھی۔ وہ ایک عام مدرسے میں پڑھتا تھا جہاں اس کا کوئی دوست نہ تھا اور سب بچے اسے احمق خیال کرتے تھے۔ اسے لڑکوں کی ایک خصوصی جماعت کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ اس جماعت کا عمومی ذہنی آئی کیو (IQ) 164 تھا۔ وہاں اس لڑکے کو فوراً ہی قائد کے طور پر قبول کر لیا گیا اور جماعت کے دوسرے لڑکے اس پر اعتماد کرنے لگے اور اس کا احترام بھی بہت کرنے لگے۔

یہ مثال ہمیں بتاتی ہے کہ ہوشیار بچوں کو اپنے کند ذہن ساتھیوں کے ساتھ زیادہ میل جول پر مجبور نہ کیا جائے تو وہ بہت سی غیر ضروری تکالیف سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ بچپن میں ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ میل ملاپ سے اچھی طرح زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ سیکھا جاسکتا ہے، مجھے تو یہ بات بالکل فضول دکھائی دیتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص بھی بعد کی زندگی میں ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ میل ملاپ نہیں رکھتا۔ کتب ساز پادریوں کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں ہیں اور نہ ہی پادریوں پر پابندی ہے کہ وہ کتب سازوں کے ساتھ رہیں۔ بالغ زندگی میں کسی شخص کا پیشہ اور رتبہ اس کی دلچسپیوں اور صلاحیتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ میں اپنے زمانے میں مختلف سماجی گروہوں کے درمیان

http://muftbooks.blogspot.com/

رہا ہوں۔ ان میں سفارت کار، یونیورسٹی اساتذہ، امن پسند، قیدی اور سیاست دان سبھی شامل تھے لیکن کسی جگہ بھی مجھے لڑکوں کی منڈلی جیسی غیر منظّم بے رحمی سے پالا نہیں پڑا۔ اکثر ذہین لڑکوں نے ابھی تک اپنی ذہانت کو چھپانے کا ڈھنگ نہیں سیکھا۔ اس لئے انہیں اپنے نرالے پن کے لئے مسلسل تختہ مشق بننا پڑتا ہے۔ ان میں سے جو اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھالنے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں وہ وقت کے ساتھ ساتھ عام قسم کا فرد نظر آنے کا سلیقہ سیکھ لیتے ہیں۔ خیر، میرے نزدیک تو یہ کوئی قابلِ قدر کامیابی نہیں ہے۔ آپ کسی باڑے سے گزریں تو وہاں آپ کو گائیں، بھیڑیں، سور، بکریاں، بطخیں، مرغیاں اور کبوتر اپنے اپنے مخصوص انداز کے ساتھ دکھائی دیں گے۔ کوئی یہ تقاضا نہیں کرتا کہ بطخ کو سور کے چال چلن سیکھ کر سماجی ہم آہنگی کا ثبوت دینا چاہئے۔ تاہم مدرسے میں لڑکوں سے بالکل یہی تقاضا کیا جاتا ہے جہاں سور حاکم بنے پھرتے ہیں۔

زیادہ ہوشیار بچوں کے لئے خصوصی سکولوں کے فوائد بہت بڑے ہیں۔ وہ نہ صرف دوسروں سے بچنے والی تکالیف سے بچ جائیں گے بلکہ جذباتی افسردگی اور بزدلی کا سبق سیکھنے سے بھی محفوظ رہیں گے جو اکثر بالغوں کو صاحب اقتدار احمقوں کی خاطر اپنی ذہنی صلاحیتوں کو ضائع کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ خالص عقلی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس قسم کے خصوصی مدرسے ہوشیار بچوں کو زیادہ تیزی سے تعلیم مہیا کر سکیں گے یوں انہیں سنی سنائی باتوں کو دوبارہ سننے کی بوریت برداشت نہ کرنی پڑے گی۔ یہ بھی کہ وہ آپس میں جو بات چیت کریں گے اس سے ان کے علم کو تقویت پہنچے گی اور ان کے فرصت کے مشاغل کسی تمسخر کے خوف کے بغیر ذہانت آمیز ہو سکیں گے۔ اس قسم کے مدرسوں کے خلاف جو اعتراض کیا جا سکتا ہے، اس کا تعلق صرف انتظامی دشواریوں اور اس جمہوری جذبے سے ہو سکتا ہے جو اصل میں جذبہ رقابت سے پیدا ہوتا ہے۔ موجودہ صورتحال تو یہ ہے کہ ہر ذہین لڑکے یا لڑکی کو عجیب و غریب ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ خصوصی مدرسوں کے قیام سے یہ احساس مٹ جائے گا۔

ہر قسم کے بڑے تعلیمی نظام کی مشکلات میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے منتظمین عام طور پر استاد نہیں ہوتے۔ لہٰذا انہیں اس امر کا تجربہ نہیں ہوتا کہ کیا ممکن ہے اور کیا محال۔ جب کوئی شخص درس و تدریس کا کام شروع کرتا ہے تو بشرطیکہ وہ خصوصی طور پر ذہین

http://muftbooks.blogspot.com/

طلبہ کی منتخب جماعتوں کو پڑھا رہا ہو، حیرت کے ساتھ دریافت کرتا ہے کہ نوجوان لوگ اس کی توقع سے کم سیکھتے ہیں اور سیکھنے کی رفتار اس کی توقع سے کہیں زیادہ سست ہوتی ہے۔ کوئی مضمون پڑھنے کے قابل ہوسکتا ہے۔ البتہ ضروری نہیں کہ وہ پڑھانے کے قابل بھی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پڑھانے کے لئے جو وقت مقرر ہوتا ہے، اس کے دوران اکثر طلبہ کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ تدریسی تجربے کے بغیر جو لوگ نصاب سازی کا کام کرتے ہیں، ان کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ نصاب میں بہت کچھ ٹھونس دیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گہرے طور پر کسی چیز کا علم بھی حاصل نہیں ہوتا۔ دوسری طرف ایک تجربہ کار استاد اور طرح کا تعصب رکھتا ہے اور وہ بھی اتنا ہی ناپسندیدہ ہے۔ چونکہ اسے شاگردوں کی میرٹ کی بنیاد پر درجہ بندی کرنا ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ ایسے مضامین کو ترجیح دینے کا میلان رکھتا ہے جن میں اس بارے میں شعبے کی گنجائش نہ ہو کہ آیا شاگرد نے درست جواب دے دیا ہے۔ لاطینی گرام کے دیرینہ رواج کا تعلق اسی بات سے جوڑا جاتا ہے۔ اسی حوالے سے ریاضی کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ برطانیہ کے ابتدائی مدرسوں میں اسے ضرورت سے بہت زیادہ وقت دیا جاتا ہے۔ بے شک ایک عام آدمی کو روزمرہ کے حساب کتاب سے آگاہ ہونا چاہئے۔ تاہم اسے ریاضی کی اس سے زیادہ ضرورت شاذونادر ہی پیش آتی ہے۔ سکول میں پیچیدہ ریاضی کا جو علم وہ حاصل کرتا ہے، بعد کی زندگی میں اس کی افادیت لاطینی کے علم کی طرح نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ اس سے کہیں اچھی بات یہ ہے کہ ابتدائی مدرسوں میں صحت کے ابتدائی اُصولوں کی تعلیم دی جائے۔

ضرورت سے زیادہ تعلیم دینے کا مسئلہ اہم ہے اور مشکل بھی۔ یہ مسئلہ اہم اس لحاظ سے ہے کہ جب کسی ہوشیار شخص کو ضرورت سے زیادہ تعلیم دے دی جائے تو وہ بے ساختگی، خود اعتمادی اور اچھی صحت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ معاشرے کا اس سے کم مفید رکن بن کر رہ جاتا ہے جتنا کہ وہ بصورت دیگر ہوسکتا تھا۔ یہ مسئلہ مشکل اس اعتبار سے ہے کہ موجود علم میں اضافے سے زیادہ پیچیدہ عملی مسائل اور سائنسی دریافت دونوں حوالے سے تمام متعلقہ علم پر عبور حاصل کرنے بتدریج دشوار ہوتا چلا جاتا ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ زائد از ضرورت تعلیم کی خرابیوں سے محض یہ کہہ کر محفوظ نہیں رہا جاسکتا کہ ''بچوں کو موج اُڑانے دو اور ان پر زیادہ پڑھائی کا بوجھ نہ ڈالو''۔ ہمارے سماجی ڈھانچے

http://muftbooks.blogspot.com/

کا انحصار تربیت یافتہ اور باعلم ذہانت پر بڑھتا جا رہا ہے۔ موجودہ عالمی کساد بازاری کا ایک بڑا سبب عملی افراد میں تعلیم کی کمی ہے۔ مثلاً اگر بنکار اور سیاستدان کرنسی اور کریڈٹ کے مسائل سے آگاہ ہوتے تو چھوٹے سے لے کر بڑے تک ہم سب موجود حالت سے کہیں زیادہ خوشحال ہوتے۔ ایک مثال لیجئے۔ سائنس کی ترقی کی موجودہ رفتار اس وقت تک برقرار نہیں رہ سکتی جب تک کوئی شخص پچیس برس کی عمر تک موجود علم کی حد تک پہنچنے کے قابل نہ ہو، کیونکہ تیس برس کی عمر کے بعد کم لوگ ہی گہری ذہنی وفکری صلاحیت کے حامل رہ جاتے ہیں۔ پیچیدہ دنیا میں ایک عام شہری اس وقت تک اپنا کردار ادا نہیں کرسکتا جب تک وہ موجود حالت سے زیادہ اس امر کا عادی نہ ہو جائے کہ عملی مسائل کو تعصّبات، جذبات یا محض سرسری طور پر حل نہیں کیا جاسکتا۔ انہیں حل کرنے کے لئے تربیت یافتہ ذہانت کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر جدید سماجی نظام میں ذہنی تعلیم بے حد اہم ضرورت ہے۔

کافی حد تک تعلیم کا ہونا ضروری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ضرورت سے زیادہ تعلیم کی قباحتوں سے بچنا بھی چاہئے۔ اس کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ پہلے اور اہم بات یہ ہے کہ حصول علم کے ضمن میں جذباتی دباؤ ممکنہ حد تک کم ہونا چاہئے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب امتحانات اور وظائف کے موجود نظاموں میں گہری تبدیلیاں لائی جائیں اور جہاں تک ممکن ہو، ہوشیار بچوں کی علیحدہ تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ جذباتی دباؤ نقصان دہ تھکاوٹ کی بڑی وجہ ہے۔ جسمانی تھکن کی طرح رات کی نیند عقلی تھکن کو بھی دور کر دیتی ہے۔ اس کے برخلاف جذباتی تھکن مطلوبہ نیند کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے یا پھر برے خوابوں کے ذریعے نیند کا سکون تباہ کر دیتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ تعلیم کے زمانے میں نوجوانوں کی زندگی پریشانی سے محفوظ ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایسی تمام تعلیم کو سختی کے ساتھ ختم کر دیا جائے جو کوئی مفید مقصد پورا نہیں کرتی۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ بچوں اور نوجوانوں کو صرف وہی کچھ حاصل کرنا چاہئے جس کو ''مفید'' علم کا عنوان دیا جاتا ہے۔ ہاں میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ انہیں بعض چیزیں محض اس لئے نہیں پڑھانی چاہئیں کہ وہ ہمیشہ سے پڑھائی جاتی رہی ہیں۔ میں نے مدرسے سے فارغ ہونے والے نوجوانوں سے اکثر پوچھا ہے کہ تاریخ میں انہوں نے

http://muftbooks.blogspot.com/

کیا کچھ پڑھا ہے۔ان سے ملنے والے جواب سے میں نے دیکھا ہے کہ ایک ہی تاریخ کو ہر جماعت میں بار بار دہرایا جاتا ہے اور اس سے زیادہ نوجوانوں کو کچھ نہیں بتایا جاتا۔میرا معاملہ خصوصی ہوسکتا ہے تاہم میں نے کبھی اپنے آپ کو ایسی حالت میں نہیں پایا کہ جس میں یہ جاننا حقیقی طور پر مفید ہو کہ مثلاً اٹھارہویں صدی میں مرسیا اور ویسکس کی سلطنتوں کے تعلقات کس قسم کے تھے۔تاریخ میں ایسا بہت سا مواد ہے جس کا جاننا اَز حد مفید ہوسکتا ہے۔تاہم مدرسوں میں اسے کم ہی پڑھایا جاتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ تمام اعلیٰ تعلیم اس خیال سے دینی چاہئے کہ طالبِ علم میں تحقیق وجستجو کی روح بیدار ہو اور وہ تحقیق کے طریقہ کار کو جان سکے۔محض اس خیال سے تعلیم دینا مناسب نہیں کہ طالبِ علم سوالات کے صحیح جوابات سے آگاہ ہو سکے۔اس معاملے میں بھی الزام امتحانات پر ہی آتا ہے۔مثال کے طور پر اگر کسی نوجوان کو انگریزی ادب کا کوئی ابتدائی امتحان پاس کرنا ہے تو اس کے لئے بہتر مشورہ غالباً یہی ہے کہ وہ بڑے ادیبوں کا ایک لفظ بھی نہ پڑھے۔بلکہ کسی نصابی کتاب کو زبانی یاد کرلے جس میں ساری معلومات تو درج ہوتی ہیں لیکن کام کی کوئی بات نہیں ہوتی۔امتحان کی خاطر نوجوانوں کو ہر قسم کی چیزیں، مثلاً تاریخیں وغیرہ، زبانی یاد کرنا پڑتی ہیں۔حالانکہ زیادہ معقول بات یہ ہوتی ہے کہ ان کو حوالہ جاتی کتب میں سے تلاش کرلیا جائے۔صحیح قسم کی تدریس کتابوں سے فائدہ اُٹھانے کا درست طریقہ سکھاتی ہے۔وہ حافظے پر ایسا بوجھ نہیں ڈالتی جو کتابوں کو غیر ضروری بنا دیتا ہے۔پوسٹ گریجویٹ تعلیم میں اس امر کا اعتراف پہلے ہی کرلیا گیا ہے۔تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کے زیادہ ابتدائی مراحل پر بھی اس طریقہ کار کو اختیار کیا جائے۔مزید براں طالب علم کی تحقیق کے بارے میں رائے اخذ شدہ نتائج کی جدت یا قدامت کے حوالے سے نہیں بلکہ علم کی وسعت اور استدلال کی معقولیت کے حوالے سے قائم کی جانی چاہئے۔طریقہ کار نہ صرف صحیح فیصلہ کرنے کی قوت کی تعلیم دے گا بلکہ طالبِ علم کی پیشِ قدمی کو بھی استقلال عطا کرے گا۔یوں اس عمل میں مضمر تھکن کے بڑے حصے کا خاتمہ ہو جائے گا۔ذہنی کام کی تھکن زیادہ تر بیزار کن چیزوں کی طرف مجبوراً توجہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔لہٰذا جو طریقہ کار بوریت کو ختم کرتا ہے، وہ تھکن کو بھی ختم کر دیتا ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

ان طریقوں کے مدد سے صحت اور بے ساختگی کو خطرے میں ڈالے بغیر اعلیٰ قسم کا حصول ممکن ہوسکتا ہے۔ البتہ جب تک امتحانات اور مسابقت کا جبر موجود ہے، یہ حصول ممکن نہیں ہوسکتا۔ مقابلہ نہ صرف تعلیمی حقیقت کے طور پر ناگوار ہے بلکہ اسے نصب العین کے طور پر نوجوانوں کو پیش کرنا بھی غلط ہے۔ دنیا کو اب جس چیز کی ضرورت ہے وہ مسابقت و مقابلہ نہیں، بلکہ تنظیم اور تعاون ہے۔ مقابلے کی افادیت میں یقین رکھنے کا مطلب ماضی میں رہنا ہے۔ مزید براں مقابلہ مفید ہوتو بھی وہ بذاتِ خود قابلِ تعریف نہیں کیونکہ جو جذبے اس سے منسلک ہیں وہ دشمنی اور بے رحمی کے جذبے ہیں۔ جن لوگوں کی پال پوس مقابلے تصور کے مطابق ہوتی ہے وہ معاشرے کو ایک مربوط اور گنزم کی طرح سمجھنے میں شدید وقت کا شکار ہوتے ہیں۔ اس لئے اخلاقی اور معاشی دونوں لحاظ سے یہ بات ناپسندیدہ ہے کہ بچوں کو مقابلہ آرائی کا درس دیا جائے۔

❁❁❁

http://muftbooks.blogspot.com/

بارہواں باب

تعلیم اور معاشیات

گزشتہ ابواب میں ہم نے مغربی ملکوں میں رائج الوقت تعلیم میں ایسی باتیں دیکھی ہیں جو دعوت تنقید دیتی ہیں۔ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ نہ صرف تعلیم بلکہ دوسرے شعبوں میں بھی جو خرابیاں پائی جاتی ہیں، ان کا منبع ناقص معاشی نظام ہے۔ میں اس رائے کو درست نہیں سمجھتا۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ہر قسم کے معاشی نظام میں حماقت اور ہوس اقتدار کی کچھ نہ کچھ مقدار رہ ہی جاتی ہے اور وہ ایک کام نظام تعلیم کی تشکیل میں رکاوٹ بنتی ہے۔ خیر، اس کے باوجود تعلیم پر معاشی عوامل کا اثر ورسوخ بہت گہرا ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ اثر ورسوخ سطح پر بھی ہمیشہ واضح ہو۔ اس باب میں ہم کوشش کریں گے کہ مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کے شعبہ تعلیم میں معاشی عامل کو الگ تھلگ کر کے دیکھا جائے۔

عہدِ تاریک کے بعد جب یورپی تعلیم کا احیا ہوا تو وہ پادریوں کا امتیازی حق تھی۔ آج بھی اس میں بعض ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اس کی مذہبی اوریجن کی یادگار ہیں۔ نشاۃ ثانیہ سے پہلے عام امرا جاہل ہوا کرتے تھے۔ لیکن پادری اور خاص طور پر باقاعدہ پادری علم پر عبور رکھتے تھے۔ لاطینی زبان کا کسی قدر علم ان پادریوں کی پیشہ ورانہ ضرورت تھی۔ گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں صدیوں میں خاص طور پر سسلی اور اسپین کے ہسپانوی عربوں کے ساتھ تعلق علم کا احیا کا بڑا سبب بنا۔ ان رابطوں کے اسباب زیادہ تر معاشی تھے۔ تاہم علم پر اس کے اثرات چند افراد کی گیر متعصّب عقلی جستجو کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ مدرسی فلسفہ اور قرونِ وسطیٰ کے عمومی علوم پادریوں کی ایک چھوٹی جماعت کے جوش وخروش کا نتیجہ تھے۔ ان پادریوں میں سے اکثر کو اپنی محنت کا دنیاوی پھل کم ہی ملتا تھا۔ جب کہ بہت سے پادری اپنے قیاس وخیال کی جرات کے سبب گھاٹے میں رہتے

http://muftbooks.blogspot.com/

تھے۔اس تحریک کے لئے راہبوں اور درویشوں کا وجود ضروری تھا۔تاہم اس کا آغاز محض علم کی پیاس سے ہوا۔

کسی قدر بعد میں شروع ہونے والی عام امرا کی تعلیم کے بارے میں بھی یہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیکولر ثقافت کا آغاز شہنشاہ فریڈرک روم سے ہوا۔ عنفوان شباب ہی سے اس کا میل جول مسلمانوں سے رہا تھا۔اس کی علم کی خواہش بے پناہ تھی۔اٹلی میں پندرھویں صدی کے دوران یونانی زبان کا احیا اور دربار ثقافت کے آغاز کو علم برائے علم کی محبت سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔یہ سچ ہے کہ جلد ہی یہ محرک اوجھل ہو گیا۔ تاہم لاطینی اور کسی قدر یونی زبان کا علم شرفا کا امتیازی نشان بن گیا۔تب اسے لڑکوں پر ٹھونسا جانے لگا۔نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس کے ذوق سے محروم ہوں گے۔اس کے باجود اس زمانے میں بھی کلاسیکی علم روپیہ پیسہ کمانے کے بجائے شرافت ونجابت کے اظہار کے لئے حاصل کیا جاتا تھا۔راہب کی طرح نواب بھی فرصتوں سے مالا مال ہوتے تھے اور اگر وہ چاہتے تو کسی افادی مقصد کے بغیر محض خوش ولطف کے لئے علم حاصل کر سکتے تھے۔

یونیورسٹیوں میں اور میرے جیسے چند پرانے طرز کے فلسفیوں کے ہاں علم کو بجائے خود پسندیدہ تصور کرنے کا خیال ابھی تک موجود ہے۔تاہم بہت سے ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جنہوں نے تعلیم کے مقصد کے بارے میں مروجہ تصور کو پوری طرح بدل کر رکھ دیا ہے۔ان واقعات میں سے اہم ترین عالمگیر لازمی تعلیم پر اصرار ہے۔دیکھا یہ گیا کہ اگر لڑکوں اور لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیا جائے تو وہ بہتر شہری اور بہتر کارکن بن سکتے ہیں۔یہ بجا ہے کہ مدرسی روایت نے اس مقصد کے حصول میں سیاست دانوں کی راہ روکی۔ابتدائی مدرسوں میں تعلیم ابھی تک کم وبیش مکمل طور پر کتابی ہے۔حالانکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نیم عملی تربیت سیاست دانوں کے مقصد کو بہتر طور پر پورا کر سکتی تھی۔اس لحاظ سے روسی تعلیم اس عہد کے تقاضوں سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔اس کے باوجود ابتدائی مدرسوں نے مجموعی طور پر ان مقاصد کی تکمیل کی ہے جن کی ان سے توقع کی گئی تھی اور اب ہر مہذب ملک میں وہ حکومت کا ایک لازمی آلہ کار بن چکے ہیں۔

تعلیم کے افادی نقطہ نظر پر زور دینے والا ایک اور عنصر سائنس اور صنعت کی ترقی ہے۔آج کل فنی اُمور سائنسی علم کا تقاضا کرتے ہیں اور نئی ایجادات دولت اور قومی

http://muftbooks.blogspot.com/

عظمت دونوں کا وسیلہ بن چکی ہیں۔ اس معاملے میں بھی روس کے سوا باقی تمام ملکوں میں ادوار گزشتہ کی روایات جدید تقاضوں سے مکمل ہم آہنگی میں رکاوٹ ہیں۔ اگر افادی اُمور کو تعلیم پر غالب رہنا ہے تو پھر سائنس اور صنعتی تکنیک پر موجودہ رواج سے زیادہ زور دینا ہوگا۔ اسی طرح ادبی ثقافت کی اہمیت کم ہو جائے گی۔ اب اگر چہ یہ تبدیلی مکمل طور پر رونما نہیں ہوئی ہے، لیکن مرحلہ وار یہ تبدیلی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ یہ عمل جلد ہی ممکن ہو جائے گا۔

تعلیم پر معاشی اسباب کے اثرات کا ذکر پانچ عنوانات کے تحت ہوسکتا ہے۔ ہم ان پر ترتیب وار بحث کریں گے۔

(1) کسی ریاست کے معاشی حالات کے حوالے سے اس رقم کا تعین ہوتا ہے جو وہ تعلیم پر خرچ کرسکتی ہے۔ گویا ہر ملک میں یہ رقم مختلف ہوتی ہے۔ تاہم اگر صنعتی انقلاب کی وجہ سے مغربی اقوام خوشحال نہ ہو چکی ہوتیں تو سب لوگوں کی تعلیم کا خواب پورا نہ ہوتا۔ کسی قوم میں علم کی اس سے زیادہ قدر نہ تھی جتنی کہ چین میں اس وقت تھی جب کہ اس نے مغربی معیاروں کو نہ اپنایا تھا۔ تاہم چین اس قدر امیر ملک نہ تھا کہ وہ اپنی آبادی کے پانچ فیصد سے زیادہ افراد کو لکھنا پڑھنا سکھا سکتا۔ 1780 بلکہ 1830 کے انگلستان میں بھی یہ بات بے حد دشوار ہوتی کہ تمام لوگوں کی تعلیمی ضروریات پورے کرنے کے لئے نئے ٹیکس لگائے جاتے۔ آج کے زمانے میں بھی چند مستثنیات کے سوا نرسری سکولوں کا اہتمام کرنا محال ہی سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف سکول چھوڑنے کی عمر میں اضافے کو معاشی مشکلات میں اضافے کا سبب نہیں سمجھا جاتا۔ بے روزگاری اور معاشی تحفظ پسندی کے باعث عملی افراد اس امر پر متفق ہیں کہ ہر شخص کا کام باقی تمام لوگوں کو غریب تر بناتا ہے۔ لہٰذا معاشرے کے لئے مفید بات یہ ہے کہ اس کے کسی ایک حصے کو پیداواری روزگار سے محروم رکھا جائے۔ اس بنیاد پر یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ اگر بچوں کو زیادہ مدت تک مدرسوں میں رکھا جائے تو ہم سب زیادہ خوشحال ہو جائیں گے۔ انگلستان میں سکول کی مدت میں اضافے کی راہ میں رکاوٹ معاشی نہیں بلکہ مذہبی ہے۔ انگلستان کے مختلف مذہبی فرقے اس معاملے میں متفق نہیں ہو سکے ہیں کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو کس قسم کے توہمات کے ساتھ عملی دنیا میں بھیجا جائے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

(2) تعلیم کا ایک مقصد مجموعی پیداوار میں اضافہ کرنا ہے۔ پوری آبادی کو تعلیم دینے کا تصور پیش کرنے والوں کے ذہن میں غالباً یہ سب سے بڑا محرک تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک اچھا محرک ہے۔ پڑھنے لکھنے کے قابل آبادی جاہل آبادی کے مقابلے میں زیادہ باصلاحیت ہوتی ہے۔ تاہم پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کا محرک زیادہ براہِ راست طور پر فنی تعلیم میں اضافے اور ساتھ ہی ساتھ سائنسی تربیت و تحقیق بڑھانے پر زور دیتا ہے۔ اگر صحیح مالی تخمینے حکومت برطانیہ کے طرزِ عمل پر اثر انداز ہوتے تو وہ تحقیقی اُمور پر موجودہ رقم سے کہیں زیادہ رقم خرچ کرتی۔ ایسا نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اکثر اعلیٰ سرکاری حکام نے کلاسیکی اور روایتی طرز کی تعلیم حاصل کر رکھی ہے اور وہ ہر اس شے سے بے خبر ہیں جو کہ کسی جدید شخص کو جاننا چاہئے۔ طبی تحقیق کی مثال لیجئے۔ ایک عام شہری زندگی کے ابتدائی اور آخری ایام میں معاشرے پر بوجھ ہوتا ہے۔ جب کہ کام کرنے کے قابل برسوں میں وہ معاشرے کے لئے مفید ہوتا ہے۔

اچھا، اب معاشی حشرات الارض کے علم کو ہی لیجئے جو کہ زراعت کے بہت سے شعبوں میں فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس موضوع پر حکومت کے قلیل خرچ کو فضول خرچی ہی سمجھا جاتا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ جن لوگوں کو تعلیم یافتہ قرار دیا جاتا ہے، ان کی اکثریت کو بھی ابھی تک سائنسی علم کی افادیت کا احساس نہیں۔ جن ان لوگوں کو یہ احساس ہو جائے گا تو ہم نہ صرف سائنسی تحقیق و تعلیم کے لئے عطیات میں بڑے بڑے اضافوں بلکہ ثانوی تعلیم کے مدرسوں کے نصاب میں سائنس کے لئے زیادہ گنجائش کی توقع بھی کر سکیں گے۔

(3) دولت کی تقسیم کا نظام تعلیم پر گہرے طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یوں کہئے کہ اس کے اثرات ان دو عوامل سے بھی زیادہ ہوتے ہیں جن کا ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ دولت کی تقسیم کا نظام مختلف طبقوں میں معاشرے کی تقسیم کا تعین کرتا ہے۔ اب جہاں مختلف طبقے موجود ہوں، وہاں ہر طبقہ مختلف قسم کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ سرمایہ دار سماج میں مزدور سب سے کم تعلیم حاصل کرتے ہیں اور جو لوگ تعلیم یافتہ پیشے کو اختیار کرنا چاہیں انہیں زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرنا ہوتی ہے۔ اس طرح جو لوگ ''شرفا'' میں شامل ہونے کے خواہش مند ہوں یا تاجر بننا چاہیں ان کے لئے درمیانی قسم کی تعلیم موزوں سمجھی جاتی ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

ایک عام اُصول یہ ہے کہ بچوں کا سماجی طبقہ وہی ہوگا جو ان کے والدین کا ہے۔ لیکن جو بچے غیر معمولی اہلیت کے سبب تعلیمی وظائف حاصل کر لیتے ہیں، وہ محنت کش طبقے سے نکل کر پیشہ ور طبقے میں شامل ہو سکتے ہیں۔ انگلستان میں اس طریقے سے محنت کش گھرانوں میں جنم لینے والے ذہین ترین بچوں کو سیاسی اعتبار سے ناکارہ بنا دیا جاتا ہے اور وہ اس طبقے کی حمایت کرنے سے دست بردار ہو جاتے ہیں جس میں انہوں نے جنم لیا تھا۔ طبقوں کے درمیان اس لچک کی بنا پر دولت پرست معاشرہ اشرافی معاشرے سے مختلف ہے اور یہی وجہ ہے کہ اشرافی معاشرے کے مقابلے میں دولت پرست معاشرے میں انقلاب برپا ہونے کا امکان کم ہوتا ہے۔

جس معاشی نظام کو اس کے مخالف سرمایہ دارانہ قرار دیتے ہیں، وہ ایک پیچیدہ نظام ہے۔ ہمارے مقاصد کے حوالے سے ضروری ہے کہ اس کا کسی قدر تجزیہ کیا جائے۔ میری رائے میں سوویت یونین کے سوا باقی دنیائے جدید میں دولت کے تین بڑے وسائل ہیں۔ اول زمین کی ملکیت اور فطری اجارہ داری۔ دوم پدری خاندانی نظام میں وراثت اور سوم کاروبار۔ یہ تینوں باہم اس طرح مربوط ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکے۔ ہنری جارج ان میں سے پہلے وسیلے کو ختم کرنے کا خواہش مند تھا، جب کہ باقی دو کو جوں کا توں چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ عیسائیوں کے کیتھولک دنیاوی مذہبی نظام میں پہلا وسیلہ موجود ہے اور تیسرے کا امکان بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن دوسرے کے لئے اس میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ سامی نسل کے بہت سے مخالفین، جیسا کہ ان کی مخالفانہ تنقید سے ظاہر ہوتا ہے، پہلے اور دوسرے وسیلے کو برقرار رکھنے اور تیسرے کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ زمین کی ملکیت اور وراثت کے رواج چونکہ اشرافی زمانے کی باقیات ہیں اس لئے کاروبار کے مقابلے میں ان پر اشتراکی نکتہ چینی زیادہ ہوسکتی ہے۔ جہاں صرف تیسرا وسیلہ کامیابی کا واحد ذریعہ، جیسا کہ مثلاً ہنری فورڈ کا معاملہ ہے.....تو یہ بات مشکوک ہی رہتی ہے کہ آیا اس سے مجموعی طور پر معاشرے کو فائدے کے مساوی نقصان بھی پہنچتا ہے۔

اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ عام مفہوم میں طبقے کا تصور وراثت کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا۔ خاص طور پر تعلیم کے معاملے میں اہم بات یہ ہے کہ خوشحال گھرانوں کے

http://muftbooks.blogspot.com/

بچوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے وہ مزدوروں کے بچوں کو ملنے والی تعلیم سے مختلف ہوتی ہے۔ امریکہ میں مالدار لوگوں کا طبقہ یورپ کے امیروں کے مقابلے میں اشرافی باقیات سے کم متاثر ہے۔ امریکہ کا یہ طبقہ کاروبار کو عموماً دولت کا بڑا وسیلہ خیال کرتا ہے۔ نوجوانوں پر اس ذہنیت کا جو اثر پڑتا ہے وہ اس معاشرے میں پڑنے والے اثر سے مختلف ہوتا ہے جس میں زمین کی ملکیت اور وراثت دولت کے سماجی طور پر نمایاں وسائل ہوں۔ یہ انفرادی جدوجہد پر زور دیتا ہے اور اس حد تک قابلِ تعریف بھی ہے۔ لیکن جدوجہد پر یہ زور مسابقت کی ایک صورت کے طور پر دیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ سماجی دشمن ہے۔

زیادہ منصفانہ معاشی نظام میں موجودہ قسم کی مسابقت کے لئے جگہ نہ ہوگی۔ نہ ہی اس میں موجودہ قسم کے طبقات ہوں گے۔ یہ درست ہے کہ اس نظام میں کسی نہ کسی قسم کا مقابلہ باقی رہے گا اور کسی نہ کسی طرح کے طبقات بھی موجود رہیں گے۔ لیکن ان دونوں کی صورت اس سے بہت زیادہ مختلف ہوگی جس سے ہم شناسا ہیں۔ اشتراکی معاشرے میں قوت واقتدار کے بعض عہدے ہوں گے اور ایسے عہدے بھی ہوں گے جن پر کام کرنا غیر معمولی طور پر خوش گوار ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قسم کے عہدوں کے مالک ہوں گے وہ کمتر قوت اور ناگوار کام کے عہدوں پر کام کرنے والوں کے مقابلے میں ایک اعلیٰ تر طبقہ کی تشکیل کریں گے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان بہتر عہدوں کے حصول کے لئے مسابقت اور مقابلہ بھی ہوگا۔ ہاں، یہ ہے کہ وراثت اور والدین کے اثر ورسوخ کے خاتمے سے ہر شخص محض اپنی شخصی صلاحیتوں کی اساس پر مقابلہ کرے گا اور اسے بہتر تعلیمی مواقع کی گیر منصفانہ سہولت بھی حاصل ہوگی۔ اگر وہ اپنے ہمسایہ کے مقابلے میں بہتر تعلیم حاصل کرے گا تو اس لئے نہیں کہ اس کا باپ زیادہ امیر ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ تعلیم حاصل کرنے زیادہ اہلیت کا حامل ہوگا۔ اس قسم کے معاشرے میں طبقات کے وجود کا جو بھی جواز ہو اس کی بنیاد ہر ایک صورت میں ہر شخص کی شخصی اہلیت ہوگی۔ مثال کے طور پر وہاں وائلن کا ایک عظیم فن کار معمولی قسم کے فن کار سے ہمیشہ ہی برتر ہوگا۔ اسے زیادہ معاوضہ ملے نہ ملے، لیکن زیادہ احترام ضرور حاصل ہوگا۔ عدم مساوات اور مسابقت کا یہ درجہ ناگزیر ہے۔ اس عدم مساوات کی جڑیں اشیاء کی فطرت میں پیوست ہیں اور یہ مسابقت اس لئے ضروری ہے کہ مشکل کام وہی لوگ کریں جو اس کی سب سے زیادہ اہلیت رکھتے ہیں۔ یہی

http://muftbooks.blogspot.com/

وجہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ تعلیم کا مسئلہ، جس پر ہم نے ایک گزشتہ باب میں بحث کی تھی، بہت مشکل ہے۔ البتہ تعلیمی مسابقت آج کل کی صورتِ حال کے مقابلے میں کم شدید ہوگی جب کہ سب لوگوں کو نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنے بچوں کے لئے بھی معاشی تحفظ حاصل ہو گا۔ عدم مساوات اور عدم تحفظ ہی نے مقابلے کو آج کل تلخ بنا رکھا ہے۔ چنانچہ جب ان دونوں عناصر کو خارج کر دیا جائے گا، تو مقابلے کی تلخی بھی جاتی رہے گی۔

وطن کی محبت کے جذبے کے محرک کئی ہیں۔ تاہم نجی ملکیت کے ساتھ اس کا ایسا تعلق ہے جو فوری طور پر عیاں نہیں ہوتا اور اکثر لوگ اس سے بے خبری بھی ہیں۔ اصل میں یہ ایک پیچیدہ تعلق ہے جسے سرمایہ داری کی زیادہ ظالمانہ صورتوں نے جنم دیا تھا۔ سرمایہ کار کے نقطہ نظر سے پسماندہ ملکوں کے دو فائدے ہیں۔ اول یہ کہ منڈی ہیں اور دوسرے وہ خام مواد مہیا کرتے ہیں۔ ان دونوں حوالوں سے پسماندہ ملک اس وقت زیادہ مفید ہوتے جب وہ اس ملک کے ماتحت ہوں جس سے سرمایہ کار کا تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ شمالی افریقہ میں فرانسیسی سرمائے کے لئے، ہندوستان میں برطانوی سرمائے کے لئے اور وسط امریکہ میں امریکی سرمائے کے لئے بہترین حالات موجود تھے۔ اس طریقے سے ہوتا یہ ہے کہ جو سرمایہ کار اپنے ملک سے باہر سرمایہ کاری کا منصوبہ بناتا ہے وہ دوسرے ملکوں پر قبضہ کرنے کے خیال سے نہ سہی لیکن معاشی حوالے سے سامراج پرست ضرور بن جاتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حب الوطنی کے موزوں پراپیگنڈے کے ذریعے وہ اپنے کاروبار کے اخراجات کا خاصا حصہ ٹیکس ادا کرنے والوں کے کھاتے میں ڈال سکتا ہے۔ طاقتور قوموں کے جذبہ حب الوطنی کا بڑا سبب یہی واقعہ ہے۔ البتہ قومی جھنڈے اٹھا کر نعرے لگانے والے عوام سرمایہ کاروں کے ان ناپاک عزائم سے بے خبر ہی رہتے ہیں۔ کمزور اقوام کی قوم پرستی سفاک قوموں کی قوم پرستی سے محفوظ رہنے کی ایک کوشش ہے۔ جب تک چھوٹی قومیں دوسروں کا استحصال کرنے کی بجائے دوسروں کے استحصال کی مزاحمت کرتی ہیں، تب تک وہ طاقتور قوموں سے بہتر اخلاقی مقام کی حامل ہوتی ہیں۔ لیکن آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والی کمزور قوم میں ایسے احساسات پیدا ہو جاتے ہیں کہ جونہی وہ آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی ہے اس میں وہ تمام برائیاں آجاتی ہیں جن کے سبب وہ طاقتور اقوام پر نکتہ چینی کرتی تھی۔ پولینڈ نے کم وبیش دو

http://muftbooks.blogspot.com/

صدیوں کی غلامی کے بعد آزادی کی نعمت حاصل کی۔لیکن اسے اہلِ یوکرائن کو غلام بنانے میں کوئی عار محسوس نہ ہوا۔قوم پرستی اُصول کے طور پر خباثت ہے اور آزادی کے لئے کوشاں اقوام میں بھی اس کی موجودگی قابلِ تعریف نہیں ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ قوموں کو جارحیت کی مزاحمت بھی نہیں کرنی چاہئے۔مطلب اس کا یہ ہے کہ اس قسم کی مزاحمت قومی کے بجائے بین الاقوامی نقطہ نظر سے ہونی چاہئے۔قوم پرستی کی برائیاں، چاہے وہ طاقتور قوم میں ہو یا کمزور قوم میں، نجی ملکیت سے منسلک ہیں۔ان کا تعلق استحصال سے یا پھر استحصال کی مزاحمت سے ہے۔لہٰذا یہ فرض کرنا معقول بات ہے کہ اگر نجی سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جائے تو پھر تعلیم کے شعبے میں قوم پرستی جو قابلِ نفرت کردار ادا کر رہی ہے، وہ اگر پوری طرح ختم نہ ہو تو بھی بڑی حد تک ختم ہو جائے گی۔

(4) تعلیم پر معاشی عوامل کے اثرات کے ضمن میں چوتھا موضوع اوقاف ہیں۔جہاں کہیں وصیت کے ذریعے ہبہ کرنے کی آزادی ہے، وہاں کوئی شخص اپنی جائیداد کسی ایسے مقصد کے لئے وقف کر سکتا ہے جس کو عوامی پالیسی کے خلاف نہ سمجھا جاتا ہو۔ حالیہ زمانے تک انگلستان میں عقل پرستی کی تبلیغ کے لئے وصیت کو غیر قانونی سمجھا جاتا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ عقل پرستی کسی مذہبی ملک کی عوامی پالیسی کے خلاف ہے۔اب صورتِ حال یہ نہیں رہی۔خیر، ترقی پسند مقاصد کے لئے اوقاف برا غیر قانونی نہ سہی، لیکن یہ بات ناگزیر ہے کہ اوقاف زیادہ تر قدامت پسند قوت رہیں گے۔یہ ان لوگوں کی خواہشات کے پیکر ہیں جو مر چکے ہیں۔ان میں سے کئی لوگ ایسے ہیں جن کی وفات صدیوں پہلے ہوئی تھی۔ مذہبی عبادت گاہیں، پرانی یونیورسٹیاں اور بہت سے مدرسے کسی نہ کسی حد تک اوقاف پر انحصار رکھتے ہیں۔امریکہ میں اوقاف کی روایت پرانی نہیں۔لیکن وہاں یہ اوقاف بڑے بڑے امیر لوگوں کی دین ہوتے ہیں۔یہ لوگ لازمی طور پر قدامت پسند اور عموماً جاہل ہوتے ہیں۔اس طرح وہ تعلیم کے میدان میں ترقی پسند تحریکوں کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ایک ایسی یونیورسٹی کا صدر، جس کے پروفیسروں پر انتہا پسندی کا شبہ ہو، وہ بڑے بڑے انسان دوست سرمایہ داروں سے عطیات حاصل کرنے میں اس سربراہ کے مقابلے میں کم ہی کامیاب ہوگا جس کے رفقائے کار ماجودہ نظام کے علمبردار ہوں۔

http://muftbooks.blogspot.com/

تعلیم مذہبی پہلو کو زیادہ قدامت پسند بنانے میں اوقاف کو کافی حد تک دخل ہے۔ نجی ملکیت کے ساتھ مذہب کا تعلق اس حقیقت سے نمایاں ہوتا ہے کہ لوگ اپنا مال و زر مذہبی اداروں کے لئے وقف کر جاتے ہیں یوں ان کی موت کے صدیوں بعد تک ان توہمات کی تبلیغ و اشاعت کا انتظام ہو جاتا ہے جن میں وہ ایمان رکھتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ انگلستان اور سکاٹ لینڈ میں اس امر کو قانون کے ذریعے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ریفرمیشن کے زمانے میں قرون وسطیٰ کے پاکباز لوگوں کی چھوڑی ہوئی جائیداد کو اس کے ابتدائی مقاصد سے الگ کر کے کلیسائے انگلستان کی تعلیمات کی تبلیغ کے لئے وقف کر دیا گیا تھا۔ سکاٹ لینڈ میں جب قانونی طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ ''فری چرچز'' کی جائیداد ''وی فریز'' کو منتقل ہو گی، تو قانون میں اس مقصد کے لئے تبدیلی کی گئی تا کہ متعصّب گرجاؤں کی وصیتیں ان عقائد کی تبلیغ کے لئے استعمال کی جا سکیں جن سے جبریت پسندی کو خارج کر دیا گیا تھا۔ تاہم امریکہ میں آئین اس قسم کی قسمو سازی کی ممانعت کرتا ہے۔ اگر کوئی اپنی دولت ایک ایسے ادارے کے سپرد کر جاتا ہے جو اس عقیدے کا پرچار کرتا ہے کہ کنٹکی کے باشندے دس گمشدہ قبائل سے تعلق رکھتے ہیں تو پھر آپ کی وقف کردہ رقم کو اس مصرف سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ انگلستان میں انحراف ممکن تو ہے لیکن درحقیقت شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ انگلستانی کلیسا اور رومن کیتھولک چرچ مالدار ادارے ہیں اور ان کی آمدنی صرف ان لوگوں کے کام آ سکتی ہے جو ان اداروں کے نزدیک موزوں نظریات کے حامل ہوں۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ پرانے آباؤ اجداد کی آرا کو قبول کئے رکھنے کے لئے بہت سے مالی محرکات موجود ہیں۔ ہر عقلی ترقی کے لئے ایک معاشی سزا موجود ہے۔ چنانچہ جب کولینسو نے یہ دریافت کیا کہ خرگوش جگالی نہیں کرتا تو اس غریب کو اپنی تنخواہ سے محروم ہونا پڑا۔

اگر مذہبی اوقاف نہ ہوں تو بلاشبہ چیزیں موجودہ رفتار سے کہیں زیادہ تیزی سے تبدیل ہونے لگیں۔ خیر اب بھی وہ حقیقت میں اس سے زیادہ تیزی سے تبدیل ہوتی ہیں جتنی کہ بظاہر دکھائی دیتی ہیں۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن میں کلیسائے انگلستان کو اپنے ایمان کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ ہاں وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایمان محض اقرار ہی ہے اور اگر وہ ایسا کہیں تو کوئی انہیں برا نہیں سمجھتا۔ مسیحی ایمان کے بعض حصے ایک وقت میں موثر ہوتے ہیں اور بعض کسی دوسرے وقت۔ مثلاً آج کل اکثر عیسائیوں کی رائے یہ ہے کہ حضرت

http://muftbooks.blogspot.com/

عیسیٰؑ نے طلاق کے موضوع پر جو کچھ کہا تھا اس کی لفظی تعبیر قبول کرنی چاہئے۔ البتہ مزاحمت نہ کرنے، قسم نہ کھانے اور غریبوں کو اپنی جائیداد دینے سے متعلق ان کے اقوال کی تشریح وتوجیہہ مجازی طور پر یوں ہونی چاہئے کہ جو کچھ حضرت عیسیٰؑ نے کہا ہے، اس کے الٹ مطلب اخذ کیا جا سکے۔ خیر، یہ ایک پیچیدہ سا سوال ہے کہ ایک عیسائی کو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کے کون سے حصے قبول کرنے کی اجازت ہے۔ میں اس بارے میں مزید کچھ نہیں کہوں گا۔

(5) تعلیم پر معاشی اثرات کے ضمن میں ہمارے غور وفکر کا پانچواں عنوان روایت ہے۔ اس سے میری مراد عمومی روایت نہیں جو کہ ایک وسیع و بسیط مسئلہ ہے۔ میری مراد کسی معاشی عامل سے اخذ شدہ روایت ہے، یعنی ایسا عامل جو دور گزشتہ میں افعال تھا، لیکن اب نہیں۔ جنسی اخلاق، جو کہ عام طور پر بہت قدامت پسند ہوتے ہیں، اس عامل کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں۔ دور گزشتہ میں جب کہ دنیا اس قدر گنجان آباد نہ تھی اور بچوں کی شرح اموات زیادہ تھی تو والدین زیادہ بچے پیدا کر کے انسانیت کی خدمت سرانجام دیتے تھے۔ جب تک تعلیم نے اور بچوں کی محنت کی ممانعت نے بچوں کو والدین کے لئے مال بوجھ نہ بنایا تھا، اس وقت تک بچے اکثر صورتوں میں اپنے والدین کے لئے مالی فائدے کا سبب ہوا کرتے تھے۔ ان دنوں میں برتھ کنٹرول اور اسقاط حمل کے خلاف احساسات کا مناسب معاشی جواز موجود تھا۔ وہ جواز اب نہیں رہا لیکن برتھ کنٹرول اور اسقاط حمل کے خلاف احساسات اب بھی موجود ہیں کیونکہ وہ مذہب سے منسلک ہو گئے ہیں۔

پدری خاندانی نظام کی بنیاد واضح طور پر معاشی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حمل اور رضاعت کے ایام میں عورتیں کامیابی سے شکار نہ کر سکتی تھیں۔ زمانہ حال تک عورتوں کو حصول معاشی کا کوئی آزادانہ موقع حاصل نہ تھا۔ اس لئے وہ اپنے شوہروں یا مرد رشتہ داروں کی محتاج ہونے پر مجبور تھی۔ پدری خاندان کا نظام عورتوں کی کفالت اور بیٹوں کو جانشینی کی منتقلی کو شامل حال رکھتا تھا۔ اس لئے اس نظام نے بیویوں کی پاکبازی پر فطری طور پر اصرار کیا اور سخت مذہبی اور اخلاقی سزاؤں کے ذریعے اس پاکبازی کو رواج دیا۔ ابتدائی تہذیبوں میں زنا کے جرم میں عورتوں کو عموماً موت کی سزا دی جاتی تھی۔ جب قانونی سزا نرم ہو گئی اور بالآخر چند بوسیدہ مذہبی مکوں کے علاوہ ہر جگہ ختم ہو گئی۔ لیکن اخلاقی اور مذہبی

http://muftbooks.blogspot.com/

مذمت برقرار رہی۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا، روایتی ضابطے کا یہ حصہ، نظری طور پر نہ سہی، لیکن عملی طور پر، مردوں کے ساتھ عورتوں کی مساوات کے دعوے سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

عورتیں جب اپنی روزی خود کمانے لگیں تو پھر ان کے مساوات کے دعوے کی مزاحمت نہیں کی جا سکتی۔ شادی شدہ عورتوں کو روزگار کے حصول سے روکنے کے لئے مجنونانہ کوششیں کی جاتی ہیں۔ تاہم یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ اس قسم کی کوششیں زیادہ مستقل کامیابی حاصل کر سکتی ہیں۔ ایسے طریقوں کی تعداد بھی بڑھتی جائے گی جن کے ذریعے روایتی نقطہ نظر سے پاک دامن نہ ہوتے ہوئے بھی کوئی عورت روزی حاصل کر سکے گی۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ اخلاقی ضابطہ اخلاق معاشی اسباب کی بنا پر ٹوٹتا جا رہا ہے۔ شرح پیدائش میں کمی اور فوجی جنون نے مل کر بچوں کی فلاح و بہبود میں ریاست کا بتدریج بڑھتا ہوا مفاد پیدا کر دیا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ حکومت کے نقطہ نظر سے یہ گھاٹے کا سودا ہے کہ کوئی بچہ میدانِ جنگ میں شہید ہونے سے پہلے ہی دوسرے جہان کو سدھار جائے۔ جب عورتوں کی پاک بازی کے خاتمے کے لئے معاشی اسباب یکجا ہو جائیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ بچوں کی پال پوس میں ریاست کے کردار کو بڑھا دیں تو پھر یہ بات بالکل صاف ہے کہ باپ کی اہمیت کم ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی وہ تمام جذبے اور اخلاقی اُصول بھی رخصت ہو جائیں گے جو پدری خاندانی نظام کا جزو بن چکے ہیں۔

موجودہ زمانے میں والدین اور ریاست دونوں اس بات کو اچھا سمجھتے ہیں کہ جنسی اُمور سے متعلق بچوں کو ایسے رویئے کا درس دیا جائے جو ماضی کی یادگار ہے اور جو آج کی دنیا کے تقاضے پورا نہیں کرتا۔ یہ جنس اور خاندان سے متعلقہ اُمور میں جذبے کی قدامت پسندی کی ایک مثال ہے۔ تعلیم کے معاملے میں یہ قدامت پسندی خاص طور پر مضبوط ہے کیونکہ اکثر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ بچوں کو سخت قسم کی اخلاقیات کا درس دینے سے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اس طرح سے تعلیم معاشروں کو نئی تقاضوں سے مطلوبہ رفتار کے ساتھ ہم آہنگی سے روکتی ہے۔ اور بہت سے بالغ مرد اور عورتیں اپنی ابتدائی تربیت کی وجہ سے ان چیزوں کے بارے میں خوف کا شکار ہو جاتے ہیں جن کو مسلمہ جان کر قبول کر لینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ گویا معاشی عوامل نے اس جنسی اخلاق کی تشکیل میں حصہ تو لیا ہے جو مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے، تاہم ان عوامل کا تعلق ماضی سے ہے اور وہ آج کی

http://muftbooks.blogspot.com/

معاشی ضروریات کے حوالے سے کسی جواز کی حامل نہیں۔

جیسا کہ ہم نے ابھی دیکھا نجی ملکیت سے وابستہ معاشی عوامل تعلیم کو قدامت پسند بنانے کا رجحان رکھتے ہیں۔ تاہم یہ امر مشتبہ ہے کہ انقلابی دور کے خاتمے کے بعد اشتراکی نظام میں وہ کم قدامت پسند ہو جائے گی۔ تب وہ مکمل طور پر مربوط افسر شاہی کے زیرِ اثر ہو گی اور عام طور پر افسران تبدیلی کے خواہش مند نہیں ہوا کرتے۔ شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ تب موجود زمانے کے مقابلے میں تیز رفتار تبدیلی کی ضرورت کم ہو گی۔ شاید ایک پرامن زمانہ استحکام کی وجہ سے نسل انسانی کی صورتِ حال بہتر ہو جائے گی۔ خیر جو بھی ہو، مقابلے کی جگہ تعاون کو ایک تعلیمی نصب العین قرار دینا بہرطور ایک ٹھوس اخلاقی پیش رفت قرار پائے گا۔ یہ کام معاشی نظام میں ایک مکمل تبدیلی ہی سے پورا ہو سکے گا۔ محض اس بنیاد پر یہ امید کرنا جائز ہو سکتا ہے کہ موجودہ نظام کی موجودگی میں مغربی دنیا جس قسم کے انسان پیدا کر رہی ہے، اشتراکی نظام میں تعلیم اس سے بہتر انسان پیدا کرے گی۔

❁❁❁

http://muftbooks.blogspot.com/

تیرھواں باب

تعلیم میں پروپیگنڈہ

پروپیگنڈے کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ اس سے مراد ہر وہ کوشش ہے جس سے کسی جھگڑے میں انسانوں کو کسی ایک پارٹی کا ساتھ دینے کی ترغیب دی جا سکے۔ پروپیگنڈہ جبر سے سے مختلف شے ہے کیونکہ اس میں جبر سے کام نہیں لیا جاتا۔ یہ فرق اصل میں طریقہ کار کا فرق ہے۔ دوسری طرف پروپیگنڈہ مقصد کے اعتبار سے تعلیم سے مختلف ہے۔ کیونکہ پروپیگنڈہ کا مقصد علم کی اشاعت نہیں بلکہ ایک خاص قسم کا گروہی احساس پیدا کرنا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تعلیم اور پروپیگنڈے میں اس کے سوا کوئی اور فرق نہ ہو، کیونکہ پروپیگنڈہ مکمل طور پر درست معلومات پر بھی مبنی ہوسکتا ہے۔ (اگرچہ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے) تاہم اس صورت میں بھی وہ ایسی معلومات پر بھی مبنی ہوتا ہے جو ایک خاص سمت کی طرف رجحان رکھتی ہیں۔ مخالف رجحان رکھنے والی معلومات کو اس میں سے خارج کر دیا جاتا ہے۔

قصیدے اور ہجو، سائنسی نفسیاتی تجزیے کے برعکس، پروپیگنڈہ کی ذیل میں آتے ہیں، اگرچہ اکثر انسانوں میں اس قدر خوبیاں یا خامیاں ہوتی ہیں کہ قصیدہ یا ہجو لکھتے وقت جھوٹ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس طریقے سے دوستانہ یا مخالفانہ نقطہ نظر سے کسی قوم کی تاریخ لکھنا ممکن ہے اور ایسا کرتے ہوئے صرف درست بیانات تک مورخ اپنے آپ کو محدود بھی رکھ سکتا ہے۔ اس صورت میں قاری تک پہنچنے والا تاثر غلط ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مورخ بہت سی باتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

ہر قسم کی تعلیم میں پروپیگنڈہ کوئی نہ کوئی کردار ادا کرتا ہے۔ کوئی بالغ شخص اپنی

http://muftbooks.blogspot.com/

پسند و ناپسند کے اظہار سے باز نہیں رہ سکتا۔ جب اس قسم کا اظہار بچوں کی موجودگی میں کیا جائے تو وہ پروپیگنڈے کا اثر رکھتا ہے۔ معلم کے لئے سوال یہ نہیں کہ پروپیگنڈہ ہونا چاہئے یا نہیں۔ سوال بس یہ ہے کہ کسی قدر، کس قسم کا اور کس قدر منظّم پروپیگنڈہ روا ہے۔ یہ سوال بھی اہم ہے کہ آیا تعلیم کے کسی مرحلے پر لڑکوں اور لڑکیوں کو غیر جانبدار فیصلوں تک پہنچنے کے طریقے سکھا کر، جہاں تک ممکن ہو سکے، پروپیگنڈہ کے اثر سے آزاد کرنا چاہئے۔

ریفرمیشن کے زمانے سے تعلیم میں پروپیگنڈے کا کردار بتدریج بڑھتا رہا ہے۔ سب سے پہلے جیسویٹ فرقے نے اس کی تکنیک پر عبور حاصل کیا۔ تاہم پروٹسٹنٹ فرقہ کے لوگ بھی ان سے زیادہ پیچھے نہ رہے۔ چنانچہ انہوں نے انگلستان میں سپین کی احتساب کی عدالت، سمتھ فیلڈ کی آگ اور بارود کی سازش سے پورا فائدہ اٹھایا۔ سترھویں صدی کے مقابلے میں اٹھارہویں صدی انقلاب فرانس کے آغاز تک زیادہ پر امن اور پروپیگنڈے سے کافی حد تک آزاد تھی۔ اٹھارہویں صدی کی جنگیں اپنے نتائج کے اعتبار سے اہم ہونے کے باوجود زیادہ خون خوار نہ تھیں اور وہ فریقین کو باہمی احترام سے نہ روک سکیں۔ تاہم جیکوبن فرقے نے یورپ میں شدت کی لہر پیدا کر دی۔ جب کہ نپولین کے، خلاف طویل لڑائی نے انگریزوں کو تنگ نظر اور جرمنوں کو محبت وطن بنا دیا۔ اس زمانے سے آج تک ترقی اور رجعت کے درمیان تضاد زیادہ سے زیادہ تلخ ہوتا گیا ہے۔ جب کہ عام مردوں اور عورتوں کی زندگی میں قوم پرستی بتدریج زیادہ کردار ادا کرتی چلی گئی ہے۔ آج کے زمانے میں مختلف اقوام، بلکہ کسی ایک قوم کے مختلف سیاسی گروہ بھی نہ صرف اپنے اعتقادات کی وجہ سے، بلکہ جو کچھ وہ جانتے ہیں اور نہیں جانتے، ممتاز افراد کے بارے میں اپنی آرا اور مستقبل سے متعلق اپنی امیدوں اور خدشوں کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ ہو کر رہ گئے ہیں۔

دنیائے جدید میں جو تقسیمیں پائی جاتی ہیں، پروپیگنڈہ اول اول تو ان کا نتیجہ تھا اور بعد میں ان کا سبب بن گیا۔ اصلاح مذہب کی تحریک سے پہلے یورپ میں ایک خاص حد تک اتحاد موجود تھا۔ جو مذہب کے باغی تھے، ان کے ساتھ سزاؤں کے ذریعے نمٹ لیا جاتا تھا۔ لہٰذا جدید مفہوم میں پروپیگنڈے کی ضرورت نہ تھی۔ البتہ مذہبی جنگوں کے زمانے میں فتح یا شکست کا انحصار دوسروں کی حمایت حاصل کرنے پر تھا۔ انقلابی جنگوں میں فرانس

http://muftbooks.blogspot.com/

کو حاصل ہونے والی فتح کا ایک بڑا سبب جیکو بن پروپیگنڈے سے پیدا ہونے والی قوت اور جوش و ولولہ تھا۔ اشتراکیت کی ساری تعمیر ہی پروپیگنڈہ پر ہوئی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اگر قوم پرستی کا پروپیگنڈہ نہ کیا جاتا تو قومیں ان قربانیوں کے لئے آمادہ نہ ہوتیں جن کا تقاضا جنگ عظیم نے کیا تھا۔

عام تعلیم نے پروپیگنڈہ کے مواقع میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ہر جگہ تعلیم پروپیگنڈہ کی صورت اختیار کر گئی ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ پڑھنے کی اہلیت پوری کی پوری آبادی کو اخبارات سے اثر پذیر ہونے کے قابل بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آخری جنگ پہلے تمام جنگوں سے زیادہ تلخ تھی۔ جن لوگوں نے پڑھنے کی اہلیت تو حاصل کر لی تھی لیکن اور کچھ نہ سیکھا تھا، انہیں ظلم و تشدد کی داستانوں سے متاثر کیا جا سکتا تھا۔ گزشتہ زمانوں میں صورت حال یہ تھی کہ لوگ یا تو بالکل ہی تعلیم سے محروم ہوتے تھے یا پھر انہوں نے اچھی خاصی تعلیم حاصل کی ہوتی تھی۔ ان دونوں صورتوں میں وہ پروپیگنڈے کے اثرات سے نسبتاً زیادہ محفوظ رہتے تھے۔ اس امر سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج کے زمانے میں پروپیگنڈے کی جو اہمیت ہے، پہلے کبھی نہ تھی۔

پروپیگنڈے کی بڑی صورتیں تین ہیں..... (1) سیاسی جماعتوں کے حق میں (2) عقائدے کے حق میں اور (3) قوموں کے حق ہیں۔ ان تین صورتوں میں سے پہلے کو ریاست علانیہ طور پر اپنے ذمے نہیں لے سکتی۔ تاہم وہ بہت چھوٹی سیاسی جماعتوں کے خلاف پروپیگنڈے کا محاذ کھول سکتی ہے جیسے کہ انگلستان اور امریکہ میں حکومتوں نے اشتراکیوں کے خلاف کھول رکھا ہے۔ سیاسی جماعتوں کے لئے پروپیگنڈہ عام طور پر تعلیم کے دوران میں نہیں کیا جاتا۔ یہ بجا ہے کہ امیر لوگوں کے مدرسے کا ماحول قدامت پسند ہوتا ہے۔ ان میں پڑھنے والے اکثر بچے بڑے ہو کر قدامت پسند ہی بنتے ہیں لہٰذا ان میں جماعتی پروپیگنڈے کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی۔ مدرسوں میں عقائد اور اقوام کو پروپیگنڈے کا مناسب موضوع خیال کیا جاتا ہے۔ رومن کیتھولک لوگ اپنے بچوں کو کیتھولک مدرسوں میں تعلیم دلانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ پروٹسٹنٹ فرقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ ہلکے مذہبی ماحول کو ترجیح دیتے ہیں جو کہ بڑی حد تک ان کے عقیدوں کی ترجمانی کرتا ہو۔ ہر بڑی قوم سرکاری مدرسوں میں قوم پرستی کا جذبہ پیدا کر دیتی ہے اور اس امر کو ہر عام

http://muftbooks.blogspot.com/

شہری کی تعلیم کا سب سے زیادہ قیمتی جزو خیال کرتا ہے۔ اشتراکی معاشرے میں قوم پرستی کا درس نہیں دیا جاتا۔ ہاں اشتراکیت کے لئے پرزور پروپیگنڈہ ضرور کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی سوویٹ یونین کو اس کے قلعہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس بارے میں شبہ کیا جا سکتا ہے کہ بچوں کے ذہن پر اس کا جو اثر ہوتا ہے، آیا وہ سرمایہ دار ملکوں میں تعلیم کے ذریعے پیدا ہونے والے قوم پرستی کے جذبے سے زیادہ مختلف ہوتا ہے۔

تعلیم میں پروپیگنڈہ عموماً کامیاب رہتا ہے۔ البتہ ناکامی کی کوئی خاص وجہ موجود ہو تو اور بات ہے۔ انسانوں کی اکثریت اپنے آبائی مذہب کو قبول کر لیتی ہے اور اس قوم پرستی کو بھی اختیار کر لیتی ہے جس کا درس مدرسوں میں دیا جاتا ہے۔ امریکہ میں تارکانِ وطن کے بچے محبِّ وطن امریکی بن جاتے ہیں اور عام طور پر اپنے والدین کے اصلی وطن سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ زیادہ تر یہ مدرسوں کی تعلیم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ البتہ جب کسی جنگ میں شکست ہو جائے تو اس سے قوم پرست پروپیگنڈے کو شدید دھچکا پہنچتا ہے۔ بہت سے روسی 1917 میں قوم پرست نہ رہے تھے اور بہت سے جرمن 1918 میں قوم پرستی سے بے زار ہو گئے تھے۔ البتہ معاہدہ ورسائے نے ان میں سے اکثر جرمنوں کو بین الاقوامیت سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

پروپیگنڈہ اس قت تک عموماً ناکام نہیں ہوتا جب تک وہ لوگوں کو ایسی بات پر ایمان لانے کو نہ کہے جس سے وہ ابتدا ہی سے نفرت کرتے ہوں۔ چنانچہ نہ ہی جنوبی آئرلینڈ کے لوگوں کو پروپیگنڈے کے سہارے برطانوی قوم پرستی کا جذبہ محسوس کرنے پر آمادہ کیا جا سکا اور نہ ہی وہ پروٹسٹنٹ فرقے کی طرف مائل کئے جا سکے۔ پروپیگنڈے نے کامیاب ہونا ہے تو اسے کسی ایسی شے کو ذہن نشین کرانا چاہئے جو کسی نہ کسی قسم کی جبلی کشش رکھتی ہو۔ اس صورت میں وہ گروہ احساس کی شدت میں آگ لگا سکتا ہے۔ جہاں نفرت پہلے سے ہو، پروپیگنڈہ اس میں شدت پیدا کر سکتا ہے۔ جہاں توہم پرستی موجود ہو، وہ اسے بڑھا سکتا ہے۔ جہاں ہوس اقتدار خوابیدہ ہو، وہ اسے بیدار کر سکتا ہے۔ تاہم اچھے اور برے دونوں کاموں کے سلسلے میں پروپیگنڈے کے امکانات کی حدود ہیں۔ کم از کم ابھی تک تو صورتحال یہی ہے۔ جب اجتماعی نفسیات مکمل ہو جائے گی تب حکومتوں کو اس امر کا کلی اختیار حاصل ہو جائے گا کہ وہ جو چاہیں اپنی رعایا سے منوا سکیں گی۔

http://muftbooks.blogspot.com/

پروپیگنڈے کا تعلق اقدار، عمومی مسائل یا حقائق سے ہوسکتا ہے۔ کسی قدر مختلف اُمور کا ان تینوں صورتوں پر اطلاق ہوتا ہے۔

مطلق اقدار ایسے معاملات نہیں جن میں استدلال ممکن ہو اگر کوئی شخص مصیبت اور رنج کو پسندیدہ سمجھتا ہے اور اس کے نزدیک یہ اچھی بات ہوگی کہ ہر آدمی ہمیشہ شدید دانت کے درد میں مبتلا رہے تو ہم اس سے اختلاف کر سکتے ہیں اور دندان ساز کے پاس اسے جاتے ہوئے دیکھ کر اس کا مذاق بھی اڑا سکتے ہیں، لیکن یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ اس کا نقطہ نظر غلط ہے۔ ہاں اگر وہ یہ کہتا کہ پانی لوہے سے بھاری ہوتا ہے، تو اور بات تھی۔ تب ہم اسے غلط ثابت کر سکتے تھے۔ اگر کوئی لال بجھکڑ یہ کہے کہ خوشی صرف ان لوگوں تک محدود ہونی چاہئے جن کے نام ''ز'' سے شروع ہوتے ہیں تو پھر ممکن ہے کہ جتنے زاہد، زکریا یا زوار ہیں، وہ اس کے گن گانے لگیں۔ لیکن بالآخر اسے دوسرے نام رکھنے والوں کی فوج ظفر موج کے ہاتھ ہزیمت اٹھانا پڑے گی۔ بہرطور یہ اس لال بجھکڑ کے پیغام یا دعوے کی عملی تردید ہوگی۔ منطقی اعتبار سے اس کا پیغام ویسا ہی ٹھوس ہوگا جیسا کہ اس کی ضد۔ مطلق اقدار کے معاملے میں انسان اتفاق یا اختلاف کر سکتے ہیں۔ وہ توپوں یا ووٹوں سے لڑ سکتے ہیں، لیکن منطقی اعتبار سے وہ ایک دوسرے کو دلائل نہیں دے سکتے۔

عملی زندگی میں خالص منطقی صورتوں میں مطلق اقدار سے متعلق سوالات شاذ و نادر ہی اٹھائے جاتے ہیں، کیونکہ لوگوں کا تعلق اس امر سے ہوتا ہے کہ کیا کرنا چاہئے۔ کسی کام کو کرنے کا انحصار دو باتوں پر ہوتا ہے۔ (1) اس کے نتائج کس قسم کے ہوں گے۔ (2) آیا یہ نتائج مجموعی طور اچھے ہوں گے یا زیادہ درست طور پر یوں کہئے کہ آیا کسی خاص کام کے اثرات اس دوسرے کام کے اثرات سے بہتر ہوں گے جو ان حالات میں کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں سوالات میں سے پہلا سائنسی ہے اور اخلاقی نہیں ہے۔ دوسرے تمام سائنسی سوالات کی طرح اس میں عقلی دلیل سے کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب ''کیا کرنا چاہئے'' کے بارے میں نزع پیدا ہو جائے تو دلائل سے اس کا فیصلہ کرنے کا کوئی نظری امکان موجود نہیں ہے۔

سیاسی جھگڑوں میں دو قسم کے اختلافات ہوا کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک محض رسمی اختلاف ہے اور دوسرا حقیقی۔ اگر کسی آدمی کو صرف اس کی جبلتوں کے سہارے پر چھوڑ

http://muftbooks.blogspot.com/

دیا جائے تو وہ یہ دعویٰ کرنے لگے گا کہ صرف اس کی اپنی خوشی ہی سب سے بڑی اچھائی ہے اور یہ کہ دوسرے درجے پر اس کے خاندان کی خوشی آتی ہے۔ بعد ازاں اس کی قوم، اس کی جماعت اور اس کے ہم مذہب افراد کی خوشی کا درجہ آتا ہے بشرطیکہ ان کی خوشی اس کی اپنی خوشی سے متصادم نہ ہو۔ اب اگر یہ شخص مختار کل شہنشاہ ہے تو پھر وہ ساری زندگی اس رائے کو قائم رکھ سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ شہنشاہ نہیں (عام طور پر تو ایسا ہی ہوتا ہے) تو پھر وہ اپنا ارادہ ساتھیوں کی مدد سے پورا کر سکتا ہے، لیکن ساتھیوں کی مدد اس وقت حاصل ہو گی جب وہ کم از کم ظاہری طور پر کسی ایسے مقصد کے لئے سرگرم ہو جس سے اس کے ساتھیوں کو بھی دلچسپی ہو۔ جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، یہ دکھاوا جزوی طور پر حقیقی ہو گا اور جزوی طور پر بناوٹی۔ جس حد تک وہ حقیقی نہیں ہے، اس حد تک اس کا انحصار جزوی طور پر ہیجان پیدا کرنے پر ہو گا اور جزوی طور پر مغالطہ آمیز استدلال پر۔ مغالطہ آمیز استدلال جو کردار ادا کرتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا کہ جدید زمانے کے عقل دشمن خیال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر پہلی جنگ عظیم کے بعد 1931ء تک برطانوی صنعت کو برطانوی کاری کی بھینٹ چڑھایا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانوی صنعت کاروں کا ایک بڑا گروہ برطانوی بینک کاروں کے پیش کردہ مغالطہ آمیز استدلال کے فریب کا شکار ہو گیا تھا۔ ہر سیاسی جماعت اگرچہ کسی نہ کسی گروہ کے مفادات کی حقیقی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ تاہم وہ دلیل بازی کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے کہ وہ دوسرے گروہوں کے مفادات کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ البتہ اگر وہ کوئی معقول دلیل پیش نہ کر سکے تو پھر وہ جذبات کو بھڑکا کر وہی نتیجہ پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں مطلق اقدار سے متعلق کوئی نزاع پیدا نہیں ہوتا کیونکہ کوئی سیاسی جماعت بھی اس گروہ کی خود پرستی کا اقرار نہیں کر سکتی جس کے مفادات کو فروغ دینے کی خاطر وہ معرض وجود میں آتی ہے۔ ہر سیاسی جماعت دعویٰ کرتی ہے کہ اس کا مقصد پورے معاشرے کی مسرتوں میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنا ہے..... اگر اس دنیا میں نہیں تو پھر اسے دوسرے جہان میں یہ کارنامہ سرانجام دینا ہو گا۔ لہٰذا مطلق اخلاقی اقدار کے مسئلے کو ان کی ذہنی صورت میں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اپنی جذباتی صورتوں میں وہ سیاسی اہمیت برقرار رکھتے ہیں۔

http://muftbooks.blogspot.com/

اس ساری بحث سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سیاسی جھگڑوں کا ایک حصہ ایسا ہے جس میں سائنسی استدلال کی گنجائش موجود ہے۔ جب کوئی گروہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے مفادات کسی دوسرے گروہ کے مفادات سے حقیقی طور پر یکساں ہیں تو نظری طور پر ہمیشہ اور عملی طور پر کبھی کبھار اس کے دعوے کو سائنسی طور پر ثابت یا مسترد کیا جا سکتا ہے۔ سامراجی اقوام یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ پسماندہ قومیں (یعنی ایسی اقوام جو طاقتور مسلح افواج سے محروم ہوتی ہیں) ان کی غلامی میں اس سے زیادہ خوش ہیں جتنی کہ وہ آزاد ہونے کی صورت میں ہوتیں۔ جب تک عورتوں کو ووٹ دینے کا حق نہ ملا تھا، مرد یہ کہا کرتے تھے کہ عورتیں جنسی مساوات کی حکومت کے مقابلے مردوں کی حکومت کے تحت زیادہ خوش وخرم ہیں۔ سرمایہ دار یہ دعوی کرتے ہیں کہ مزدوران کی عقل مندانہ سرکردگی میں اس سے زیادہ خوش حال ہیں جتنے کہ صنعت کو سرکاری تحویل میں دینے کی صورت میں ہوتے۔ عام طور پر اس قسم کے دلائل مخاطب محکوم گروہ کے کچھ حصے کو متاثر کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ تاہم چونکہ انہیں ذاتی مفاد کی تائید حاصل نہیں ہوتی، اس لئے ممکن ہوتا ہے کہ، جب وہ مغالطہ آمیز ہوں، اس حقیقت کو دلائل کے ذریعے واضح کیا جا سکے۔ یہاں تک کہ غالب گروہ کی خود اعتمادی کو بھی اس وقت ٹھیس پہنچتی ہے جب اس کے اپنے سچے ہونے کے عقیدہ کو ضعف پہنچتا ہے۔ 1789ء میں بہت سے فرانسیسی جاگیردار اور 1917ء میں بہت سے روسی جاگیردار اس بارے میں شک وشبہات کا شکار تھے کہ آیا ان کی اپنی مراعات جائز ہیں۔ اگر اس قسم کے شبہات نہ ہوتے تو فرانسیسی اور روسی انقلاب کو کامیابی سے ہمکنار ہونے میں زیادہ مشکلات پیش آتیں۔

یہاں تک ہم نے قدر کے سوالات کے عقلی پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔ تاہم عملی طور پر اخلاقی پروپیگنڈے میں جو طریقے استعمال کئے جاتے ہیں وہ عقلی کے بجائے جذباتی ہوتے ہیں۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ تمام قدری فیصلے آخری تجزیئے میں جذبات پر مبنی ہوتے ہیں، یہ بات فطری دکھائی دیتی ہے کہ اخلاقی پروپیگنڈہ بھی جذباتی نوعیت کا حامل ہو۔ اس کے باوجود اس امر میں امتیاز کرنا ہوگا کہ کس قسم کے جذبے پیدا کئے جاتے ہیں اور یہ کام کن طریقوں سے کیا جاتا ہے۔

جذباتی پروپیگنڈہ بلاواسطہ ہوسکتا ہے اور بالواسطہ بھی۔ بلاواسطہ پروپیگنڈہ

http://muftbooks.blogspot.com/

میں متعلقہ مقصد کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے بارے میں ویسے ہی جذبے بیدار ہو جائیں جیسے کہ پروپیگنڈہ کرنے والا چاہتا ہے۔ بالواسطہ پروپیگنڈہ ایسے جذبات برانگیختہ کرنے پر مبنی ہوتا ہے جو بذات خود مقصد سے متعلق نہیں ہوتے۔ البتہ ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جو مقصد کے ساتھ ایک تعلق پیدا کر دیتی ہے۔ کلیسائی موسیقی اور وہ تمام موسیقی جو کسی سماجی گروہ کے ناطے استعمال کی جاتی ہے، اسی ذیل میں آتی ہے۔ اعلیٰ طبقے کے انگریز اپنے پبلک سکول کے لئے جو محبت محسوس کرتے ہیں وہ ایک پیچیدہ جذب ہے۔ زیادہ تر اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ سکول کے گروہوں میں بہت سے شدید قسم کے سماجی جذبے محسوس کئے جاتے ہیں۔ یہ جذبہ اس قدر شدید ضرور ہوتا ہے کہ زندگی بھر وہ قائم رہ سکے اور قابل ذکر سیاسی اہمیت کا حامل بھی رہے۔ اسی طرح رومن کیتھولک فرقے سے تعلق رکھنے والے لوگ چرچ کے لئے جو جذبہ رکھتے ہیں اس کی اساس مختلف مذہبی تقریبات کے حوالے سے چرچ سے وابستہ یادوں پر ہوتی ہے۔ لڑکپن یا عنفوان شباب کے اس قسم کے جذبے کسی سیاسی گروہ کے ساتھ منسلک ہو جائیں تو وہ ایسا احساس پیدا کر سکتے ہیں، اور اکثر اوقات کرتے بھی ہیں، جو تمام عقلی اعتقادات کو بہا کر لے جاتا ہے۔ کیتھولک چرچ نے پروپیگنڈے کی اس قسم کو خوب سمجھا ہے۔ دو ہزار سالوں کی اپنی تاریخ میں اس نے اس کی تکنیک کو مکمل کر دیا ہے۔ فوجی موسیقی اور جنگی نمائشوں کی صورتوں میں قومی ریاستیں بھی اسی قسم کا کام کرتی ہیں، البتہ وہ اس قدر خوش اسلوبی سے یہ کام نہیں کر سکتیں۔ میرے بچپن کے زمانے میں برطانوی سپاہی سرخ کوٹ پہنا کرتے تھے اور مجھے فوجی دستوں کو مارچ کرتے ہوئے دیکھ کر حاصل ہونے والی خوشی اچھی طرح یاد ہے۔ اگر اس قسم کی خوشیوں کا توڑ نہ کیا جائے تو وہ جنگ پسندی میں یقین پیدا کرنے لگتی ہیں۔

جذباتی پروپیگنڈے میں بہت سے خطرات ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسے برے کام کے لئے بھی اسی قدر آسانی سے استعمال کیا جا سکتا ہے جس قدر آسانی سے اچھے کام کے لئے۔ شاید برے کام کے لئے اسے زیادہ آسانی سے استعمال کرنا ممکن ہے۔ معقول طرز عمل کے لئے چونکہ جذبات پر کسی قدر قابو پانا ضروری ہوتا ہے، اس لئے پروپیگنڈے کی جو قسم کھردرے اور غیر مہذب جذبوں کو ابھارنے پر مشتمل ہو، وہ معقول اور مہذب طرز عمل کی راہ میں صرف رکاوٹ ہی ثابت ہو سکتی ہے۔ جب جنگ کا ماحول

http://muftbooks.blogspot.com/

پیدا ہوتا ہے تو لوگ خوشیاں مناتے ہیں کہ انہیں اپنے وحشی جذبوں کے آزادانہ اظہار کا موقع ملے گا۔ یہ خوشی اس سے زیادہ مختلف نہیں ہوتی جسے ایک سنجیدہ آدمی محبت میں گرفتار ہوتے وقت محسوس کرتا ہے۔

مذہب اور حب الوطنی دونوں پست جذبوں کو اپیل کرتے ہیں۔ یہ ایسے جذبے ہیں کہ جو تہذیب کے لئے خطرناک ہیں۔ لوگوں کو اگر مل جل کر رہنا ہے تو انہیں ایک محتاط قسم کی سماجی تنظیم درکار ہوگی۔ ساتھ ہی ساتھ انہیں ایک دوسرے کی جبلی مخالفت کو قابو میں رکھنا ہوگا۔ اگر غیر مہذب جذبوں کو کھلی چھٹی دے دی جائے تو آج کل مہذب ملکوں کی بڑی بڑی آبادیوں کو قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ اب معاملہ یہ ہے کہ مہذب لوگ محسوس کرنے کے وحشیانہ طریقوں کی طرف رجعت کی خواہش رکھتے ہیں۔ جذباتی پروپیگنڈہ کار اسی خواہش کا استحصال کرتے ہیں۔ جنگ اور مذہب اس قسم کے نوستلاجیا کی سیاسی اعتبار سے اہم ترین صورتیں ہیں۔

جذباتی پروپیگنڈہ کا ایک اور خطرہ یہ ہے کہ وہ انسان کے ذہن کو دلائل کی طرف سے بند کر دیتا ہے۔ شعوری ذہن عقل پسند ہو سکتا ہے۔ لیکن شعوری سطح کے نیچے ابتدائی برسوں کے ناقابلِ تغیر اعتقادات موجود رہتے ہیں۔ امن کے دنوں میں بہت سے لوگ عالمی اور آزاد فکر و نظر کے مالک ہوتے ہیں۔ لیکن جونہی جنگ یا موت کا خطرہ دکھائی دیتا ہے وہ محبِّ وطن یا مذہبی بن جاتے ہیں۔ یہ تبدیلی سرف جزوی طور پر سابقہ پروپیگنڈہ کی بدولت ہوتی ہے۔ زیادہ تر یہ خوف کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ تاہم خوف کو زیادہ قابلِ احترام روپ دینے، جیسے مثلاً وطن کی محبت یا خدا کی محبت کے روپ میں پروپیگنڈہ اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

عام مسائل، جیسے مذہبی عقائد، کے بارے میں پروپیگنڈہ زیادہ تر جذباتی طریقوں سے کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی کیتھولک شخص کو کیتھولک فرقے سے متعلقہ جذبے ہی عزیز ہوتے ہیں۔ لہٰذا بعض مابعد الطبیعیاتی بیانات میں ایمان کے بغیر وہ رنجیدہ رہے گا۔ جہاں کسی مذہب میں ایمان کا معاملہ ہو، بلاشبہ نظری اعتبار سے خالص عقلی وسائل سے اس کا مقابلہ کرنا ممکن ہوتا ہے۔ لیکن چند غیر معمولی طور پر عقلیت پسند لوگوں کے سوا یہ چیز کامیاب نہ ہوگی۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جب لوگوں کو کوئی بڑی تعداد ایسے مذہب کو

http://muftbooks.blogspot.com/

تیاگ دے جس کے مطابق ان کی پال پوس ہوئی ہو، تو اس کے پیچھے کوئی معاشی محرک کار فرما ہوتا ہے۔ یہ محرک اکثر اوقات لاشعوری ہوسکتا ہے۔ اگر چرچ کی زمینوں اور روم کے خراج کا معاملہ نہ ہوتا تو یورپ میں ریفرمیشن اس قدر کامیابی حاصل نہ کرسکتا تھا۔ یورپی اشتراکی زیادہ تر عیسائیت کے مخالف رہے ہیں اور وہ ثابت کرنے کے لئے معاشی دلائل پیش کرتے رہے ہیں کہ عیسائیت امیر لوگوں کے مفادات کی پاسداری کرتی ہے۔ شاذ و نادر ہی کسی مذہبی عقیدے کا منطق کے ذریعے کامیابی سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ غالباً فرانس کی اٹھارہویں صدی کی عقلیت پسندی اس معاملے کی اہم ترین مثال ہے۔ بہرطور یہ بات پسندیدہ ہے کہ انسانوں کے اعتقادات کے تعین یا ان کی عدم موجودگی کے تعین میں عقل موجودہ حالت سے زیادہ اہم کردار ادا کرے۔ بعض مسائل میں ایمان یا عدم ایمان سے جذبات کو وابستہ کرنے والا پروپیگنڈہ سائنسی روخ کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اس اعتبار سے وہ تہذیب کی راہ بھی روکتا ہے۔

اگرچہ اس امر کا امکان بہت کم ہے کہ حکومتیں اہم مسائل پر بچوں کو دوسرے گرہوں کا پروپیگنڈہ سننے کا موقع فراہم کریں گی، تاہم مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر حکومتیں اس پر رضامند ہو جائیں تو یہ بہترین بات ہوگی۔ استاد سے یہ توقع کرنے کا کہ وہ اختلافی آرا کے اظہار سے مکمل طور پر اعتراز کرے گا، مطلب یہ ہے کہ وہ کند ذہن بن جائے اور اپنی نصف شخصیت کو دبا دے۔ بے شک بہت سے لوگ کسی قسم کے جماعتی احساسات سے محروم ہوتے ہیں، لیکن ایسے لوگ شاذ و نادر ہی اچھے استاد ثابت ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی پسندیدہ نہیں ہے کہ تعلیم مصنوعی طور پر ان تمام مسائل سے نظریں چرالے جن پر معاصر واقعات منحصر ہوتے ہیں، نوجوانوں کی اس معاملے میں حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے کہ وہ تمام نقطہ ہائے نظر سے ان مسائل پر بحث و مباحثہ کو سنیں اور خود بھی ان پر غور و فکر کریں۔ سوویت نونین کے سفیر اور جناب ونسٹن چرچل کو ہر سوموار کو ریڈیو پر اشتراکیت کے موضوع پر بحث کرنی چاہئے اور سکولوں کے بچوں کو یہ بحث سننے پر مجبور کرنا چاہئے۔ جب یہ بحث تین ماہ تک جاری رہ چکے تو پھر ہر سکول میں آزادانہ رائے شماری ہونی چاہئے۔ اسی طرح دوسرے موضوعات پر بھی عوامی بحث ہونی چاہئے۔ جمہوری عمل میں شرکت کے لئے یہ بہترین قسم کی تیاری ہوگی اور نوجوان ایسے یک طرفہ بیانات سے

http://muftbooks.blogspot.com/

سچائی کو اخذ کرنے کا مشکل فن بھی سیکھ سکیں گے۔ خرابی پروپیگنڈہ میں نہیں بلکہ یک طرفہ پروپیگنڈہ میں ہے۔ پروپیگنڈہ پر نکتہ چینی بہت زیادہ پسندیدہ امر ہے اور یہ خوبی پروپیگنڈے سے دور رہ کر حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اسے حاصل کرنے کے لئے پروپیگنڈہ کو سننے اور پھر یہ دریافت کرنے کی ضرورت ہے کہ پروپیگنڈہ عام طور پر گمراہ کن ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لئے بہترین راہ یہی ہے کہ ہر سکول میں مخالفانہ نقطہ نظر سے پروپیگنڈہ کرنے والے موجود ہوں۔

میرے خیال میں سماجی ہم آہنگی کے فروغ کے لئے ایک حد تک یک طرفہ پروپیگنڈہ ضروری ہوتا ہے۔ ایسے مواقع بھی ہو سکتے ہیں جب قانون کی خلاف ورزی فرض بن جائے۔ تاہم ایسے مواقع بہت کم ہوتے ہیں اور مجموعی طور پر قانون کا احترام پسندیدہ بات ہے۔ جنگوں سے نجات حاصل کرنی ہے تو مسائل کے حل کے لئے بین الاقوامی نظام وضع کرنا ضروری ہے۔ ساتھ ہی اس ادارے کے احترام کا درس بھی دینا ہو گا جو ان مسائل کو حل کرے گا۔ کوئی امن پسند یہ کہہ سکتا ہے کہ پروپیگنڈے کا وجود نقصان دے نہیں بلکہ متضاد قسم کے پروپیگنڈے نقصان پہنچاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ہر قوم اپنی اپنی قوم پرستی کا راگ الاپنے کے بجائے صرف امریکہ کے گن گانے لگے تو پھر قوموں کے درمیان جھگڑے کا کوئی موقع پیدا نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر دنیا بھر میں معاشی تعلیمات اشتراکی طرز کی ہو جائیں، یا سرمایہ دارانہ انداز کی ہو جائیں تو اشتراکی اور مغربی ملکوں کے درمیان جھگڑے ختم ہو جائیں۔ میرے خیال میں کوئی امن پسند اس قسم کے دلائل پیش کر سکتا ہے۔ تاہم اس قسم کے منصوبے پر بہت سے اعتراضات کئے جاسکتے ہیں۔ ایسی دنیا میں کسی ترقی کا امکان باقی نہ رہے گا جس میں مشتبہ موضوع پر صرف ایک ہی نظریئے کی تعلیم دی جاسکتی ہو۔ جس دنیا میں کسی موضوع پر بحث ہی نہ ہو، وہاں تنقیدی رائے کی کوئی تربیت نہ ہو سکے گی۔ لہٰذا ترقی کے لئے اور موافق ومخالف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے تربیت دینے کی خاطر پروپیگنڈے کو حتی الامکان متنوع ہونا چاہئے۔ یہ امر ہر قسم کے سیاسی سنسرشپ پر وارد ہونے والے اعتراض کا حصہ ہے۔

تعلیم کے اہم ترین حصوں میں سے ایک، جس سے سب سے زیادہ غفلت برتی جاتی ہے، وہ ہے جو ناکافی اعداد وشمار سے درست نتائج اخذ کرنے کی تربیت دیتا ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

منطق دان کی حیثیت سے میں اس بات سے آگاہ ہوں کہ میرا یہ کہنا محض بے معنی ہے۔ اس کے باوجود عملی زندگی کی تمام تر کامیابی کا دارومدار اس بظاہر ناممکن کام کو سرانجام دینے کی صلاحیت پر ہے۔ ایک کامیاب جرنیل وہ ہوتا ہے جو یہ قیاس کر لیتا ہے کہ دشمن کے ارادے کیا ہیں۔ ایک اچھا منتظم وہ ہے جو مختصر انٹرویو کے بعد اچھے ماتحتوں کا انتخاب کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کامیاب سائنس دان بھی قیاس آرائی سے کام لیتا ہے جس کی بعد ازاں تصدیق کی جاتی ہے۔ سیاست کے میدان میں شاید ہی اس قدر مواد دستیاب ہوتا ہے جس سے کوئی معقول شخص کسی مدلل نتیجے تک پہنچ سکے۔ تاہم اکثر اوقات مواد اس قدر ہوتا ہے کہ کوئی معقول اور ہوشیار شخص دانش مندانہ نتیجے تک پہنچ سکے۔ اس کام کے لئے تعصّبات سے سائنسی انداز کی محرومی، قیاس آرائی کی صلاحیت نیز ایک اور شے درکار ہوتی ہے جسے مبہم طور پر فیصلہ سازی کی صلاحیت کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی صلاحیت ہے جو کسی خاص سمت میں مناسب مواد کے تجربے سے بہت زیادہ ترقی کرتی ہے۔ تعلیم کے کسی نہ کسی مرحلے پر نوجوانوں کو سیاسی آرا قائم کرنے کی تربیت دی جانی چاہئے۔ یہ کام یوں کیا جا سکتا ہے کہ نوجوانوں کو ایسی تقریریں سنائی جائیں جن کے بارے میں انہیں پہلے سے معلوم ہو کہ وہ گمراہ کن ہیں۔ اسی طرح انہیں ماضی کے واقعات کے بارے میں جانب دارانہ بیانات پڑھنے کو دیئے جائیں اور پھر وہ یہ اخذ کرنے کو کوشش کریں کہ اصل واقعات کیا تھے۔ یہ سب کچھ پروپیگنڈے کی ضد ہے۔ یہی اصل میں وہ طریقہ کار ہے جس کو بروئے کار لا کر انسان خود کو پروپیگنڈے سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ اپنی ان باتوں کے ذریعے میں نے اس مسئلے سے بہت حد تک متعلقہ ایک تنازعے میں جانب داری ظاہر کی ہے۔ میں نے فرض یہ کیا ہے کہ رائے محض مفید یا نقصان دہ ہی نہیں بلکہ درست یا غلط بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے مزید فرض یہ کیا ہے کہ جہاں تک واقعاتی اُمور کا تعلق ہے، کم از کم ان کے معاملے میں یہ جاننا آسان ہے کہ آیا کوئی رائے درست ہے۔ اس کے مقابلے میں رائے کی افادیت جاننا دشوار ہے۔ آخری بات میں نے فرض یہ کی ہے کہ ایک عام اُصول کے طور پر درست بات میں یقین رکھنا، غلط بات میں یقین رکھنے کے مقابلے میں مفید ہوتا ہے۔ ان تمام مفروضوں پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ نتائجیت پسندوں اور اشتراکیوں نے ان مفروضوں پر اعتراض کیا بھی ہے۔ لہٰذا

http://muftbooks.blogspot.com/

آیئے ہم ان کا زیادہ توجہ کے ساتھ جائزہ لیں۔

حساب کتاب کا معاملہ ایسا ہے کہ کوئی اشترا کی ہمارے ساتھ اتفاق کرسکتا ہے۔ لیکن جب اختلافی آرا کا معاملہ آتا ہے تو وہ یہ کہے گا کہ ایک نقطہ نظر تو بورژوا کا ہے اور دوسرا محنت کش کا۔ پھر ہمیں وہ یہ بتائے گا کہ محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والے ہر اچھے شخص کو محنت کشوں کے نقطہ نظر کی حمایت کرنی چاہئے۔ مثال کے طور پر ابدیت کا مسئلہ لیجئے۔ ایک اشترا کی یہ کہے گا کہ اس مسئلے کو حل کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ روح اور جسم کے تعلق کا جائزہ لیا جائے، یا نفسیاتی تحقیقات سے حاصل ہونے والی شہادتوں پر غور کیا جائے۔ نہ ہی اس بات کی ضرورت ہے کہ چونکہ فیصلہ کرنے کے لئے شہادت کافی مقدار میں موجود نہیں، لہٰذا اس مسئلے پر فیصلہ ملتوی کر دیا جائے۔ اشترا کی اصرار یہ کرے گا کہ ہم اس امر کو پیشِ نظر رکھیں کہ موت کے بعد جنت کے وعدے کو محنت کشوں کو اپنی بدقسمتی پر صابر و شاکر رکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر وہ وعدہ موجود نہ ہوتا تو وہ اس قدر بدقسمتی کا شکار بھی نہ ہوتے۔ اس طرح حیات ابدی کے تصور کو یوں پیش کیا جاتا ہے جیسے کہ وہ سرمایہ داری کا ہتھیار ہو جب کہ اس تصور سے انکار کو اشترا کیت کے ہتھیار کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ سوال نہیں اٹھایا جاتا کہ آیا یہ تصور درست ہے یا غلط۔ اس معاملے سے کوئی سروکار ہی نہیں رکھا جاتا۔ یہ تو ایسے ہی ہے کہ کوئی یہ پوچھے کہ آیا گولی درست ہے یا غلط۔ گولی کے بارے میں اہم سوال یہ ہوتا ہے کہ کون سی فوج اس گولی کو استعمال کر رہی ہے۔ بالکل اسی طرح کسی رائے کے بارے میں بھی یہی چیز اہم ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ نقطہ نظر سائنسی رویئے کی نفی ہے۔ سائنسی رویہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ بہت سے اُمور میں سچائی کو بڑی حد تک دریافت کیا جاسکتا ہے اور جہاں کہیں سچائی کو دریافت نہیں کیا جاسکتا وہاں واحد معقول طرزِ عمل یہ ہے کہ فیصلے کو ملتوی رکھا جائے۔ یہ بھی ہے کہ اشترا کی اپنے تشکیک پسند رویئے کو استقلال سے برقرار نہیں رکھتا۔ جدلیاتی مادیت کے فلسفے کو حقیقی معنوں میں درست تسلیم کیا جاتا ہے اور محض یہ نہیں کہا جاتا کہ اس پر یقین مزدور طبقے کے لئے مفید ہے۔ ساتھ ہی اس مقدمے کو بھی حقیقی طور پر درست مانا جاتا ہے کہ فلاں فلاں تصور مزدور طبقے کے لئے مفید ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتو اسے پروپیگنڈہ کے عمل کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ پس کسی اشترا کی کی نتاجیت پسندی نیم دلانہ ہوتی ہے اور اسے

http://muftbooks.blogspot.com/

بے صبری کے اظہار سے زیادہ نہیں سمجھا جا سکتا۔

اس بات کو میں یوں ختم کرتا ہوں کہ سچائیاں موجود ہیں۔ بسا اوقات ہم انہیں کافی حد تک جان سکتے ہیں اور اکثر اوقات یہ بات مفید ہوتی ہے، اس کے برخلاف جھوٹ میں یقین شاذ و نادر ہی مفید ثابت ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ تعلیم کے مقاصد میں سے ایک یہ ہونا چاہئے کہ نوجوانوں کو جہاں تک ممکن ہو، درست نتائج تک پہنچنے کی تربیت دی جائے۔ ایسا کرنے میں ناکامی سے گروہ بندی کی تلخی اور تباہ کن آویزش کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ عقلی پہلو کے حوالے سے یہ ناکامی سائنسی پیش رفت کی راہ میں شدید قسم کی رکاوٹ بنتی ہے۔ سیاست دانوں کو یہ ساری باتیں اس وقت ذہن نشین رکھنی چاہئیں جب وہ تعلیم کو سیاسی پروپیگنڈے کے لئے محض ایک شاخ خیال کرنے کی ترغیب محسوس کریں۔

❁❁❁

http://muftbooks.blogspot.com/

چودھواں باب

انفرادیت اور شہریت میں ہم آہنگی

پہلے باب میں ہم نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ آیا مکمل ترین انفرادی ترقی کو کم از کم ضروری سماجی ہم آہنگی کے ساتھ ملایا جا سکتا ہے؟ اس سوال نے ہمیں ان مختلف طریقوں پر غور و فکر پر مجبور کیا جن سے تعلیم معاشیات اور سیاسیات سے متاثر ہوتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان میں سے اکثر طریقے متعلقہ لڑکوں لڑکیوں کے لئے نقصان دہ ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ فرد پر سیاسیات اور معاشیات کے اثرات ہمیشہ ہی مضر ہوں؟ یا یہ ہمارے عہد کی ایک عارضی بدقسمتی ہے؟ اگر یہ ایک عارضی بدقسمتی ہے تو مستقبل قریب میں انفرادیت اور شہریت کے مابین زیادہ ہم آہنگی کی کس قدر اُمید ہے؟

سیاست سے تعلیم کو پہنچنے والا نقصان زیادہ تر دو وسیلوں سے پیدا ہوتا ہے۔ اول یہ کہ کسی جانب دار گروہ کے مفادات کو نسل انسانی کے مفادات پر ترجیح دے دی جاتی ہے اور دوم یہ کہ گروہ اور حاکم دونوں میں یکسانیت کی شدید خواہش پائی جاتی ہے۔ ان دونوں خرابیوں میں سے پہلی اس وقت زیادہ بڑی ہے۔ تاہم معاملہ یہ ہے کہ اگر پہلی پر قابو پا لیا جائے تو دوسری خرابی بہت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

تعلیم میں رواج یہ رہا ہے کہ اپنے ملک، اپنے مذہب، مردوں اور امیروں کی حمایت کی جائے۔ جن ملکوں میں بیک وقت کئی مذاہب موجود ہوتے ہیں وہاں ریاست اپنے مدرسوں میں کسی ایک کے ساتھ رعایت کرنے کے قابل نہیں ہوتی۔ تاہم اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف فرقے اور مذہب اپنے اپنے مخصوص مدرسے قائم کر لیتے ہیں یا پھر جیسا کہ نیویارک اور بوسٹن میں ہوا، کیتھولک مفاد کی خاطر پبلک سکولوں میں تاریخ کو مسخ کر کے پڑھایا جاتا ہے۔ جہاں تک صنف قوی کا تعلق ہے، آج کل اس کی حمایت ماضی کی

http://muftbooks.blogspot.com/

طرح نہیں کی جا سکتی۔ تاہم روس کے سوا باقی دنیا میں تعلیم اس طرح دی جاتی ہے کہ امیر لوگوں کے مفادات کو فائدہ پہنچے اور بلاشبہ ہر جگہ تعلیم صرف اپنی ریاست سے مکمل وفاداری کا درس دیتی ہے۔

اس صورتحال کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم مذاہب، طبقات اور اقوام کے درمیان حصولِ قوت کی کشمکش کا حصہ بن گئی ہے۔ طالبِ علم پر توجہ خود اس کے لئے نہیں دی جاتی۔ اسے تو رنگروٹ خیال کیا جاتا ہے۔ نظامِ تعلیم کو اس کی بہبود سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ تو بس پوشیدہ سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کے درپے ہے۔ یہ فرض کرنے کا کوئی جواز موجود نہیں کہ ریاست کبھی بچے کے مفادات کو اپنے مفادات پر ترجیح دے گی۔ لہٰذا ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آیا اس امر کا کوئی امکان ہے کہ جہاں تک تعلیم کا معاملہ ہے کسی ریاست کے مفادات بچے کے مفادات سے ہم آہنگ ہو جائیں۔

ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے پہلی شرط بڑی جنگوں کا خاتمہ ہے۔ اگر کسی بین الاقوامی اتھارٹی کے قیام سے یہ شرط پوری ہو جائے تو انتہا پسند قوم پرستی کی تدریس بے فائدہ ہو جائے گی اور جلد ہی اس حد تک کم ہو جائے گی کہ بے ضرر ہو کر رہ جائے گی۔ اس صورت میں نہ تو فوجی افسروں کی تربیت کی ضرورت رہے گی نہ ہی لازمی فوجی سروس کی۔ اس طرح غلط تاریخ پڑھانے کی ضرورت بھی نہ رہے گی۔ اخلاقی تربیت انسانی قتل کو نیک زندگی کی ایسی معراج قرار نہ دے گی جو تمام راہوں کی منزل مقصود ہو۔ مجھے اس امر کا یقین ہے کہ نہ صرف تعلیمی بلکہ دیگر تمام نقطہ ہائے نظر سے بھی ایسی بین الاقوامی حاکمیت کا قیام اہم ترین اصلاح ہے جو اڑیل ملکوں کے خلاف اپنے فیصلے نافذ کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔

ایسی حکومت کے قیام میں شدید قسم کی رکاوٹیں موجود ہیں کیونکہ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک بین الاقوامی طور پر قوموں کے درمیان اختلاف اور جنگیں ختم نہ ہوں۔

جنگ کے انسداد کے بعد شہری اور فرد میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی خاطر جس دوسری شے کی ضرورت ہو گی وہ توہم پرستی کا خاتمہ ہے۔ اس مقصد کی خاطر میں ہر اس عقیدے کو توہم پرستی کی صورت قرار دیتا ہوں جس کی واحد اساس روایتی یا جذباتی ہو۔ جب لوگ اس قسم کے عقائد کی بقا کو اہم قرار دیتے ہیں تو وہ ایسا نظامِ تعلیم تخلیق کرتے ہیں جو بزرگوں کی دانش کا احترام سکھائے اور عقل کے سوا دیگر بنیادوں پر مسائل حل کرنے کا

http://muftbooks.blogspot.com/

درس دے۔ حکمرانوں کی کم وبیش ناگزیر خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کی رعایا عقل پسند ہونے کے بجائے جذبات پرست ہو۔ کیونکہ اس صورت میں غیر منصفانہ سماجی نظام کے مارے ہوئے لوگوں کو اپنے مقدر پر صبر وشکر کرنے پر آسانی سے آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح توہم پرستی ظلم اور بے انصافی کا فطری ساتھی بن جاتی ہے۔ لہٰذا صرف ان ملکوں میں سرکاری تعلیم معقول رویوں اور نقطہ ہائے نظر کو فروغ دیتی ہے جن کے معاشی اور سیاسی ادارے منصفانہ ہوں۔

بلا شبہ یہ بات یقینی نہیں ہے کہ اگر طویل جدوجہد کے بعد ایک منصفانہ معاشی نظام رائج ہو جائے تو ابتداء میں اس میں توہم پرستی کو عمل دخل نہ ہوگا۔ جنگ کے زمانے میں غلط قسم کے عقیدوں کو جوش وخروش پیدا کرنے کی خاطر استعمال کیا جاتا ہے اور جنگ کے مقصد سے متعلق شکوک وشبہات کو دور کرنے کی خاطر کڑے ذہنی نظم وضبط کو مفید پایا جاتا ہے۔ روسی اشتراکیت میں پہلے ہی اس کے توہمات، ولیوں کا سلسلہ اور مقدس تاریخ شامل ہو چکی ہے۔ اگر ایک صدی کی جدوجہد کے بعد روسی نظریہ دنیا پر نظریاتی غلبہ حاصل کر لے تو اس دورانے میں اس میں بہت سی دیو مالائی داستانیں شامل ہو جائیں گی اور اس میں شدید نظریاتی تعصب پیدا ہو جائے گا۔ وہ زمانہ آنے پر اگر کوئی شخص یہ کہنے کی جرات کرے گا کہ مارکس اور لینن پوری نسل انسانی میں عظیم ترین نہیں تھے، شاید اسے قید وبند کی مصیبتیں اٹھانی پڑیں گی۔ اگرچہ اس امر کا امکان کم ہے، لیکن ہوسکتا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کو وہی مقام حاصل ہو جائے جو قرون وسطیٰ کے تاریک ادوار میں کلیسا کو حاصل تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اشتراکیت کی فتح سے پہلے کی جنگیں دنیا کے تمام صنعتی اداروں کو برباد کر دیں اور ساری دنیا کے سائنس دان اور فنی ماہرین بھی ان جنگوں کی بھینٹ چڑھ جائیں۔ اس صورت میں جب آنے والے زمانے کے لوگ اشتراکیت کی مقدس کتب میں یہ پڑھیں گے کہ لینن بجلی بہم رسانی کے ذریعے نجات کی توقع کرتا تھا، تو انہیں اس لفظ کے بارے میں تعجب ہوگا کہ ''بجلی'' کا مطلب کیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کریں کہ اس کا مطلب کارل مارکس کے ساتھ روحانی ملاپ ہے۔ لہٰذا یہ بات ناقابلِ تصور نہیں ہے کہ ایک ایسی عالمی ریاست معرض وجود میں آسکتی ہے جس کا معاشی نظام منصفانہ ہو لیکن پھر بھی اس میں اوہام پرستی کو غلبہ حاصل ہو۔ تاہم یہ صرف اسی وقت ہوگا کہ جب یہ عالمی ریاست

http://muftbooks.blogspot.com/

تباہ کن جنگوں کے بعد معرضِ وجود میں آئے گی۔ دوسرے ہر مفروضے کی بنا پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ توہم پرستی کے جو عناصر آج کل سوویٹ حکومت سے وابستہ ہیں، وہ اس وقت ختم ہو جائیں گے جب فتح جنگی ذہنیت کی ضرورت کو ختم کر دے گی۔ بالاخر تو خود اشتراکیت میں ایمان بھی اہم دکھائی نہ دینے لگے گا، کیونکہ کوئی اور نظام عملی سیاست کے دائرے میں باقی نہ رہے گا۔

اب میں دوسرے خطرے کی طرف رخ کرتا ہوں جس کا تعلق یکسانیت کی حد سے زیادہ خواہش سے ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں یہ خواہش افسر اور گروہ دونوں میں ہوسکتی ہے۔ بچے، اور خاص طور پر دس سے پندرہ برس کی عمر تک کے بچے، دوسرے بچوں میں کسی انوکھی شے کے جبلی طور پر مخالف ہوتے ہیں۔ ارباب اختیار اگر یہ محسوس کریں کہ یہ رواج ناپسندیدہ ہے تو وہ کئی طریقوں سے اس کی روک تھام کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ایک گزشتہ باب میں تجویز کیا تھا وہ زیادہ ہوشیار بچوں کے لئے الگ سکول قائم کر سکتے ہیں۔ میں انوکھے پن کی جس عدم برداشت کا ذکر کر رہا ہوں وہ احمق ترین بچوں میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ وہ ہوشیار بچوں کے مخصوص ذوق کو ان کی ایذا رسانی کی جائز وجہ قرار دیتے ہیں۔ جب خود ارباب اختیار بھی احمق ہوں (جیسا کہ ہوتا ہی ہے) تو وہ بے وقوف بچوں کا ساتھ دیتے ہیں اور ذہین بچوں کے ساتھ بری طرح پیش آتے ہیں۔

اس قسم کی صورتِ حال میں ایسا معاشرہ معرضِ وجود میں آئے گا جس میں تمام اہم عہدوں پر وہ لوگ فائز ہوں گے جن کی حماقت انہیں گروہ کو خوش کرنے کے قابل بنا دیتی ہے۔ ایسے معاشرے میں بدعنوان سیاست دان، جاہل استاد، نااہل پولیس اور بے انصاف فوج ہوں گے۔ اس قسم کا معاشرہ اگر قدرتی وسائل سے مالا مال ملک میں بھی قائم ہوگا تو اہم عہدوں کے لئے لائق لاگوں کو منتخب کرنے کی اہلیت سے محرومی کی بان پر وہ اس ملک کی دولت کو ضائع کر کے اسے مفلس بنا دے گا۔ ایسا معاشرہ آزادی کے گن گا سکتا ہے اور اس کے مجسمے بھی نصب کر سکتا ہے، لیکن بنیادی طور پر وہ اذیت دینے والا معاشرہ ہوگا اور وہ ان لوگوں کو ہی سزا دے گا جن کے خیالات اسے تباہ سے بچانے والے ہوں گے۔ یہ ساری بربادی گروہ کے ضرورت سے زیادہ شدید دباؤ کا نتیجہ ہوگی۔ یہ دباؤ پہلے سکول

http://muftbooks.blogspot.com/

میں اور بعد ازاں عام دنیا میں خود کو نمایاں کرے گا۔ جہاں کہیں اس قسم کا دباؤ موجود ہوتا ہے وہاں تعلیم کے پالیسی ساز عام طور پر اس امر سے آگاہ نہیں ہوتے کہ یہ دباؤ بھی ایک برائی ہے۔ وہ تو اسے اچھا کردار پیدا کرنے والا ایک عامل قرار دیتے ہیں اور اسے خوش آمدید کہتے ہیں۔ لہٰذا ان حالات پر غور کرنا ضروری ہے جو مدرسوں کے اساتذہ اور تعلیمی حکام کو اس غلطی میں مبتلا کرتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ آیا ایسا کوئی نظام ممکن ہے جو انہیں اس غلطی کا شکار ہونے سے بچا سکے۔

تدریس کے شعبے میں دو بہت مختلف قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو کسی مضمون کا جوش وخروش رکھتے ہیں اور وہ اس مضمون کو پڑھانے اور اپنے شاگردوں میں اس جوش وخروش کی جوت جلانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ دوسرے اسے لوگ ہیں جو اختیار اور آسانی سے حاصل ہونے والی بالادستی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ ہوس اقتدار میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن بالغ انسانوں پر حکومت کرنے کے لئے درکار مہارت سے محروم ہوتے ہیں۔ بعض نظام میں پہلی قسم کے اور بعض دوسری قسم کے لوگوں کے حق میں ہوتے ہیں۔ جدید طرزِ کارکردگی کا تقاضا یہ ہے کہ پڑھانے کے بجائے حکومت کرنے والے لوگوں کی حمایت کی جائے۔ میں اس بات سے منکر نہیں کہ حاکم قسم کے لوگوں کے بھی فائدے ہوتے ہیں۔ ایک زمانے میں میری جان پہچان ایک ایسی خاتون سے تھی جو ٹیکس کے ایک پبلک سکول میں پڑھایا کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ ریوالور سے مسلح ہو کر آتی تھی۔

دور دراز اور کم آباد علاقوں کے سوا باقی جگہوں پر غیر معمولی طور پر سرکش لڑکوں اور لڑکیوں کو علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو بچے باقی رہ جائیں گے وہ اپنے سرغنوں کی عدم موجودگی میں نسبتاً کم سخت طریقوں کی مدد سے اصلاح پذیر ہوں گے۔ جو استاد اپنے مضمون اور اپنے شاگرد دونوں سے محبت کرتا ہے وہ اکثر حالات میں نظم وضبط، طریق کار اور کارکردگی کو ترجیح دینے والے اس شخص کے مقابلے میں علم وتہذیب سکھانے میں زیادہ کامیابی حاصل کر سکتا ہے، جو علم سے محروم ہوتا ہے اور بچوں سے نفرت کرتا ہے۔ بدقسمتی سے ہر بڑے سکول میں بہت سے انتظامی اُمور بھی ہوتے ہیں اور عموماً بدترین استاد ہی ان امور سے نمٹتے ہیں۔ اب ہوتا یہ ہے کہ اعلیٰ حکام انتظامی کام کو تو دیکھتے ہیں، لیکن تدریسی کام سے بے خبر رہتے ہیں۔ لہٰذا انتظامی کام کرنے والے تو نیک نامی حاصل کر

http://muftbooks.blogspot.com/

لیتے ہیں اور دوسرے اس سے محروم رہتے ہیں۔ پھر یہ بھی کہ ہر بڑے انتظامی نظام میں اعلیٰ سطح کے افسران فطری طور پر انتظام کاری کو سب سے زیادہ باعزت اور مشکل کام خیال کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقیقی تدریسی کام روکنے والوں کے مقابلے میں مدرسوں کا انتظامی کام کرنے والوں کو بڑا رتبہ اور زیادہ تنخواہیں مل جاتی ہیں۔ یہ صورتِ حال غلط قسم کے استاد پیدا کرنے لگتی ہے۔ افسر قسم کے لوگ یکسانیت کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، جب کہ دوسری قسم کے لوگ قابلیت میں خوشی محسوس کرتے ہیں (جو بجائے خود ایک طرح کا انوکھا پن ہے) یہ لوگ قابلیت کی خاطر انوکھے پن کی دوسری صورتوں کو خوشی سے قبول کر لیتے ہیں۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ یکسانیت کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ بات بہت اہم ہے کہ حاکمیت پسند اساتذہ کے بجائے درس و تدریس سے محبت رکھنے والے اساتذہ کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

یہاں ہم ایک مسئلے کے ایسے پہلو پر پہنچ گئے ہیں جس کے بارے میں امکان یہ ہے کہ جوں جوں دنیا زیادہ منظّم ہوتی جائے گی وہ زیادہ سے زیادہ سنجیدہ صورت اختیار کرتا جائے گا۔ کسی بڑی تنظیم میں اعلیٰ عہدہ رکھنے والے شخص کے لئے ایک خاص قسم کی قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس قابلیت کو انتظامی قابلیت کا عنوان دیا جاتا ہے۔ اس سے بہت کم فرق پڑتا ہے کہ اس تنظیم کا سروکار کس معاملے سے ہے۔ اس کے سربراہ کے لئے درکار اہلیت ہمیشہ ایک سی رہتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کپاس کی تجارت کو کامیابی سے منظّم کر سکتا ہے تو وہ کسی شہر کے فضائی دفاع، کسی دور دراز مقام کی چھان بین یا عمارتی لکڑی کی نقل و حرکت کا کام بھی خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتا ہے۔ ان فرائض کو سرانجام دینے کی خاطر اسے کپاس کے علم یا فضائی دفاع کے اُمور کے علم یا جنگلات کے علم وغیرہ کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ اکثر صورتوں میں اس کے ماتحت کام کرنے والوں معاونین کو ان امور کے علم کی ضرورت ہوگی۔ جب کہ اس کی اپنی مہارت ایک لحاظ سے تجریدی ہوگی اور اس کا انحصار کسی خصوصی علم پر نہ رہے گا۔ چنانچہ ہوتا ہوں ہے کہ جب تنظیمیں حجم میں بڑھتی ہیں تو ان کے اہم عہدے سے زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں کے پاس چلے جاتے ہیں جو ان تنظیموں کے کام کے مقاصد سے اچھی طرح آگاہ نہیں ہوتے۔ یہ بات ناگزیر سہی، لیکن خطرات سے خالی نہیں۔ اپنے مبحث کی طرف رُخ کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ تعلیم کے

http://muftbooks.blogspot.com/

شعبے میں بھی اس کے خطرات موجود ہیں۔

تعلیم کے شعبے میں منتظمین کے خطرات ان کی درجہ بندی اور اعداد وشمار کی خواہش سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ امر محال ہے کہ وہ اس خواہش سے محروم ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ ان صاحبان کو بہت سے مواد سے جلد از جلد نمٹنا ہوتا ہے اور یہ کام صرف درجہ بندی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ خیر، بعض قسم کے مواد میں درجہ بندی خاصی حد تک تسلی بخش ہوتی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب طے شدہ فطری اقسام موجود ہوں۔ سبزی فروش کو دیکھیے۔ اس نے ہر سبزی کو الگ الگ ٹوکروں میں رکھا ہوتا ہے۔ وہ کبھی اس مغالطے میں نہیں پڑتا کہ ''آیا یہ شے مٹر ہے یا گوبھی کا پھول''۔ ہاں، بچوں کا معاملہ مختلف ہے۔ مثلاً یہ طے کرنا بے حد دشوار ہوتا ہے کہ آیا کوئی بچہ ذہنی طور پر ناقص ہے۔ سائنسی انداز میں بات کی جائے تو ہم کہیں گے کہ اس سوال کا کوئی صریح جواب نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن تنظیم کاری کے حوالے سے بات کی جائے تو ہمیں اس سوال کا جواب لازماً دینا ہوگا۔ لازم ہے کہ بچے کو یا تو کسی خصوصی سکول کے سپرد کیا جائے یا کسی عام سکول میں رکھا جائے۔ یوں منتظم صراحت تک رسائی کے طریقے تلاش کرتا ہے جو فطرت میں وجود نہیں رکھتی۔ چنانچہ یہ ان اسباب میں سے ایک ہے جن کی بان پر وہ ذہنی آزمائشوں کا گرویدہ ہونے کا رجحان رکھتا ہے۔ اب معاملہ یہ ہے کہ جس شے کا اطلاق ذہنی طور پر ناقص بچوں پر ہوتا ہے، اسی کا اطلاق دوسری تمام ذہنی درجہ بندیوں پر بھی ہوتا ہے۔ بچوں کے ایک چھوٹے سے گروہ کے ساتھ محبت سے پیش آنے والا شخص انہیں افراد کی حیثیت سے جانتا ہے اور ان کے بارے میں ایسے احساسات رکھتا ہے جن کو الفاظ میں بیان کرنا دشوار ہے۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ کسی بچے میں جو خاص بات ہوتی ہے، وہ اسے سب سے زیادہ پسند آتی ہے، لیکن ایک فاصلے سے، دفتری رپورٹوں کی دھند میں سے بچوں کو دیکھتا ہے، وہ اس قسم کی باتوں سے بے زار ہوتا ہے۔ اس کی خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ تمام بچے ایک جیسے ہوں تاکہ اس کا سر درد کم ہو جائے۔ تاہم وہ عمر، صنف، قومیت اور مذہب وغیرہ کی تقسیم کو قبول کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جو سب سے زیادہ روشن خیال ہوتا ہے وہ بھی ذہنی آزمائشوں کی اساس پر درجہ بندی کا قائل ہوتا ہے۔ تاہم سب سے زیادہ وسیع النظر منتظم بھی چاہتا یہی ہے کہ چیزیں لگی بندھی ہوں اور وہ ابھی انفرادی زندگی کے اس معیار کو نظر انداز کر دیتا ہے جو ہر

http://muftbooks.blogspot.com/

انسان کو دوسرے سے مختلف بناتا ہے۔اس وجہ سے یہ خطرہ موجود ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تعلیمی حکام اس یکسانیت کی حوصلہ افزائی کرنے لگیں جس کی طرف بہرطور ہماری یہ دنیا گامزن ہے۔

یہ ایک انتظامی مسئلہ ہے اور اس کا حل بھی انتظامی ہے، یعنی اختیارات کی تقسیم۔ اگر ایک عالمی حکومت وجود میں آجائے تو بلاشبہ وہ تمام تعلیم پر ایک حد تک نگاہ رکھے گی۔ وہ مقامی حب الوطنی کی زیادہ تعلیم سے منع کرے گی اور ان نظریات کی تدریس پر بھی پابندی عائد کرے گی جو اس کے نزدیک نقصان دہ ہوں گے۔ تاہم باقی تمام امور میں وہ بلاشبہ چاہے گی کہ تعلیم کا انتظام مقامی سطح پر کیا کیا جائے۔ اگر وہ سائنسی رویئے کی حامل ہوئی تو وہ نئے طریقوں سے مختلف تجربوں کی اجازت بھی دے گی۔ آج کل اکثر ناظمین کی حامل ہوئی تو وہ نئے طریقوں سے مختلف تجربوں کی اجازت بھی دے گا۔ آج کل اکثر ناظمین تجرباتی روح سے ناآشنا ہیں۔ ہاں اگر تعلیم زیادہ سائنسی ہو جائے تو اس روح کا رواج بھی زیادہ ہو جائے گا۔ سائنسی ریاست میں خامیوں اور ان ہونی باتوں کو برداشت کرنے کی خاطر ہمیں تجرباتی روح ہی سے رجوع کرنا ہوگا۔ خامیوں اور مستثنیات کے بغیر ترقی کم اور تنوع ناکافی رہے گا۔ تاہم میرے خیال میں جن افسران کو اچھی سائنسی تعلیم سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملے تو وہ خود بھی اس کے قائل ہو جائیں گے۔ اس طرح اچھی سائنسی تعلیم کے لئے صرف طبیعات اور کیمسٹری کافی نہیں، بلکہ حیاتیات کی تعلیم بھی ضرور ہے۔

اگرچہ یہ بات اہم ہے کہ انفرادیت کے جائز تقاضے فراموش نہ کئے جائیں تاہم گزشتہ زمانوں کے مقابلے میں آج کی گنجان صنعتی دنیا میں انفرادیت کو زیادہ قابو میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ ہم میں سے جو لوگ بڑے بڑے شہروں میں رہ چکے ہیں انہوں نے ہجوم میں طرزِ عمل کے ایسے طریقے سیکھ رکھے ہیں جن کی مدد سے ابتری اور بے ترتیبی پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہم دائیں ہاتھ چلتے ہیں، مناسب رفتار پر چلتے ہیں اور سڑکیں وہاں سے پار کرتے ہیں جہاں سے کرنی چاہئیں۔ زیادہ سنجیدہ امور میں بھی ایسی ہی کسی شے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پرانے زمانوں میں درویش بازاروں میں نعرے مارتے ہوئے گھومتے رہتے تھے۔ آج کے بڑے شہروں میں کوئی ایسا کرے تو ہجوم اس قدر ہو جائے کہ بازاروں کی ٹریفک ہی رک جائے اور پولیس اسے یہ تلقین کرے کہ نعرے بازی

http://muftbooks.blogspot.com/

اور وعظ دینے کی آئندہ کوئی خواہش محسوس ہو تو پہلے کوئی ہال کرائے پر حاصل کیا جائے۔ صنعتی معاشرے میں بہت کم لوگ اپنے کام میں آزاد اکائیاں ہوتے ہیں۔ انسانوں کی غالب اکثریت تنظیموں سے وابستہ ہوتی ہے اور وہ مشترکہ کام میں اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ ماضی کے مقابلے میں جب شریت اور سماجی تعاون کے زیادہ احساس کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم یہ بات آج بھی اہم ہے کہ یہ احساس انفرادی قوت فیصلہ اور انفرادی پیش قدمی کی صلاحیت کو زیادہ ضعف پہنچائے بغیر حاصل کیا جائے۔

اگر کسی شخص کی زندگی کو اس کے شخصی یا دوسرے کے نقطہ نظر سے تسلی بخش بنانا ہے تو پھر اس کے لئے دو قسم کی ہم آہنگی درکار ہوگی۔ ان میں سے ایک تو ذہانت، جذبہ اور ارادہ کی باطنی ہم آہنگی اور دوسری کا تعلق دوسرے لوگوں کے اداروں کے ساتھ خارجی ہم آہنگی سے ہے۔ ان دونوں امور کے اعتبار سے موجود تعلیم ناقص ہے۔ بچپن اور لڑکپن میں ملنے والی اخلاقی اور مذہبی تعلیم باطنی ہم آہنگی کی راہ مسدود کر دیتی ہے۔ یہ تعلیم جذبے پر برتری قائم رکھتی ہے لیکن بعد کی زندگی میں عقل پر اس کی گرفت ختم ہو جاتی ہے۔ جب کہ ارادے کو تذبذب کے عالم میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ عقل اور جذبے میں سے جس وقت کسی کو دوسرے پر غلبہ حاصل ہوتا ہے تو ارادہ بھی اس کی طرف جھک جاتا ہے۔ اگر بچوں کو ایسے نظریوں کی تعلیم دی جائے جن کو بالغ عقل قبول کر سکتی ہے، تو پھر اس قسم کے تضادات کی روک تھام بھی کی جا سکتی ہے۔ چھوٹے پیمانے پر یہ کام نجی مدرسوں میں کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ریاست کے تعاون کے بغیر اسے اس قدر بڑے پیمانے پر نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے نتائج تجرباتی اہمیت کے علاوہ بھی اہمیت کے حامل ہوں۔

دوسرے لوگوں کے ارادے کے ساتھ خارجی ہم آہنگی کا مسئلہ اور بھی مشکل ہے اور اسے مکمل طور پر حل نہیں کیا جا سکتا۔ مقابلہ اور تعاون دونوں فطری انسانی سرگرمیاں ہیں۔ انفرادیت کو ضعف پہنچائے بغیر مقابلہ و مسابقت کو پوری طرح دبانا مشکل ہے۔ تاہم یہ انفرادی اور غیر منظم مسابقت نہیں جو جدید دنیا میں نقصان پہنچاتی ہے۔ دو مرد کسی عورت کو حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کو نقصان پہنچائے بغیر مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ہاں بس یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو ٹھکانے لگانے سے گریز کریں۔ جدید دنیا میں انتشار و بے ترتیبی کی خطرناک صورت وہ ہے جو قوموں اور طبقوں کے درمیان منظم صورت میں موجود ہے۔

http://muftbooks.blogspot.com/

جب تک انتشار و بے ترتیبی کی یہ صورت برقرار رہے گی، دنیا ان ثمرات سے لطف اندوز نہ ہو سکے گی جو سائنس اور ٹیکنالوجی نے ممکن بنا دیئے ہیں۔ آج کے زمانے میں تعلیم اقوام کے مابین انتشار کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ مدرسوں میں بین الاقوامی پروپیگنڈے کو رواج دیا جائے تو اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب پہلے سیاسی بین الاقوامیت کو کامیابی حاصل ہو۔ تعلیم سیاسی کامیابیوں کا استحکام تو عطا کر سکتی ہے، لیکن جب تک تعلیم پر قومی ریاستوں کا قبضہ ہے، وہ از خود سیاسی کامیابیاں پیدا نہیں کر سکتی۔

ایسے زمانے بھی گزرے ہیں کہ جب جنگ کی صورت میں مقابلہ فتح حاصل کرنے والوں کے لئے مفید ہوا کرتا تھا، اب وہ زمانے لد گئے ہیں۔ ہر باشعور شخص اب یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر تمام ملکوں کی مسلح افواج کو ختم کر دیا جائے، قوموں کے آپس کے تمام جھگڑے بین الاقوامی عدالت کے ذریعے طے کئے جائیں، محصول کی تمام پابندیاں ختم کر دی جائیں اور لوگ آزادی کے ساتھ دنیا میں گھوم سکیں، تو پھر تمام قومیں زیادہ خوش باش ہو جائیں گی۔ سائنس نے ہمارے طریقہ کار کو یوں بدل دیا ہے کہ اب ساری دنیا ایک معاشی وحدت بن گئی ہے۔ لیکن ہمارے سیاسی ادارے اور عقیدے ہمارے طریقہ کار سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اور ہر قوم مصنوعی معاشی علیحدگی کے ذریعے اپنے آپ کو مفلس بنا رہی ہے۔ ایک طرف تو ہم ایسے طریقے اختیار کر رہے ہیں جن کے ذریعے محنت کی بچت ہو سکے اور دوسری طرف ہم بے روزگاری کے ہاتھوں پریشان ہیں۔ جب ہم اپنی مصنوعات فروخت نہیں کر سکتے تو بظاہر اس خیال سے اجرتیں کم کر دیتے ہیں کہ اگر لوگ کم کمائیں گے تو زیادہ خرچ کریں گے۔ ان برائیوں کا منبع ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری تکنیک ایک واحد پیداکار اور صارف اکائی کی حیثیت سے پوری نسلِ انسانی کے تعاون کا تقاضا کرتی ہے جب کہ ہمارے جذبے اور سیاسی عقیدے مسابقت کا تقاضا کرنے پر ڈٹے ہوئے ہیں۔

ہماری یہ دنیا پاگل دنیا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد سے وہ تعمیری نہیں رہی کیونکہ لوگ بین الاقوامی تعاون تخلیق کرنے کے معاملے میں اپنی عقل کی پیروی نہیں کر رہے۔ وہ مخالف گروہوں میں انسانوں کی تقسیم برقرار رکھنے پر زور دے رہے ہیں۔ اپنی بقا کے

http://muftbooks.blogspot.com/

مقاصد کے تکمیل کے لئے عقل استعمال کرنے سے یہ اجتماعی گریز زیادہ تر ان غیر معقول اور تخریبی محرکات کی پیداوار ہے جو ان لوگوں کے لاشعور میں پوشیدہ رہتے ہیں جن کی بچپن اور لڑکپن میں پال پوس دانشمندانہ طریقوں سے نہیں ہوتی۔ اب حالت یہ ہے کہ تکنیک مسلسل بہتر ہوتی جا رہی ہے، لیکن ہم سب مفلس تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم سب آئندہ جنگ کی حشر سامانیوں سے بخوبی آگاہ ہیں، پھر بھی بچوں کے دل میں ان جذبوں کو پروان چڑھا رہے ہیں جو اس جنگ کو ناگزیر بنا دیں گے۔ سائنس کے باوجود ہم مسائل کو عقلی طریقے سے حل کرنے کی عادت کے خلاف ہیں۔ فطرت پر ہم نے بڑا غلبہ حاصل کر لیا ہے، لیکن پھر بھی اکثر لوگ قرون وسطیٰ کے مقابلے میں بھی اپنے آپ کو زیادہ بے بس و بے کس محسوس کرتے ہیں۔ ان ساری باتوں کی جڑیں بیرونی دنیا میں نہیں ہیں۔ نہ ہی وہ ہماری فطرت کے خالص علمی حصے میں پیوست ہیں، کیونکہ ہمارا علم گزشتہ تمام ادوار کے انسانوں کے علم سے زیادہ ہے۔ ان کی جڑیں اصل میں ہمارے جذبوں میں ہیں۔۔ ہماری جذباتی عادات میں ہیں۔ یہ ان احساسات میں پیوست ہیں جن کا درس لڑکپن میں دیا جاتا ہے۔ یہ جڑیں اس خوف میں ہیں جو بچپن میں پیدا کیا جاتا ہے۔ ہمارے مسائل کا حل یہ ہے کہ لوگوں کو دانا بنایا جائے اور انہیں دانا بنانے کے لئے انہیں دانائی سے تعلیم دینا ضروری ہے۔ اس کتاب میں ہم جن عوامل پر غور کرتے رہے ہیں، وہ سب کے سب تباہی کی طرف رجحان رکھتے ہیں۔ مذہب بیوقوفی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور حقیقت کا ناکافی احساس دیتا ہے۔ جنسی تعلیم اکثر اوقات اعصابی عوارض کا سبب بنتی ہے۔ جہاں کہیں وہ کھلے طور پا عصابی عوارض پیدا نہ کر سکے، وہاں وہ لاشعور میں ایسے بیج بو دیتی ہے جو بالغ زندگی میں خوشی کو محال بنا دیتے ہیں۔ سکولوں میں جس قوم پرستی کا درس دیا جاتا ہے وہ یہ تلقین کرتی ہے کہ نوجوانوں کا سب سے بڑا فرض انسانوں کو ہلاک کرنا ہے۔ طبقاتی احساس سے معاشی بے انصافی کو چپ چاپ قبول کرنے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ جب کہ مسابقت سے سماجی جدوجہد میں جبر کو فروغ ملتا ہے۔

گویا ہماری اس دنیا میں ریاست کی تمام قوتیں نوجوانوں میں جنون، قتل و غارت پر آمادگی، معاشی بے انصافی اور جبر و تشدد پیدا کرنے کے لئے وقف ہیں۔ چنانچہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ہماری دنیا خوش و خرم نہیں ہے۔ کیا ہم ایسے شخص کو بدکار اور

http://muftbooks.blogspot.com/

تخریب کار ٹھہرائیں گے جو موجود عہد کی اخلاقی تعلیم کے ان عناصر کی جگہ عقل، دانائی، حس سلوک اور انصاف کے احساس کو دینا چاہتا ہے۔ دنیا اس قدر ناقابلِ برداشت حد تک کشیدگی کا شکار ہوگئی ہے، نفرت سے بھر گئی ہے، بدبختی اور دکھ درد کی اس قدر بہتات ہوگئی ہے کہ انسان اس متوازن قوت فیصلہ سے محروم ہو کر رہ گئے ہیں جس کی انسانیت کو موجودہ دلدل سے نکالنے کے لئے شدید ضرورت ہے۔ ہمارا زمانہ اس قدر اذیت ناک ہے کہ اکثر بہترین انسان مایوسی کا شکار ہو گئے ہیں۔ تاہم مایوسی کی کوئی معقول بنیاد موجود نہیں ہے۔ نسل انسانی کی خوش و مسرت کے وسائل موجود ہیں۔ ضرورت بس یہ ہے کہ انسان انہیں بروئے کار لانے پر آمادہ ہو جائیں۔

❁❁❁